زندگی تیرے لئے
ڈاکٹر قمر جہاں

زندگی تیرے لیے

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر قمر جہاں

نام کتاب : زندگی تیرے لیے (افسانوں کا مجموعہ)
مصنفہ : ڈاکٹر قمر جہاں
۲/سوری لے آوٹ، نزد آر ایم ایس کالونی
جعفر نگر، ناگپور/۴۴۰۰۱۳ (مہاراشٹر)
سرورق ڈیزائننگ : توصیف احمد
کمپوزرس : محمد رفیع الدین/ شبانہ پروین (Cell : 9021106583)
کمپیوٹر کمپوزنگ : ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور/۱۸
مطبع : سلمان فائن پرنٹرس، مومن پورہ، ناگپور/۴۴۰۰۱۸
تعداد بار اول : پانچ سو (۵۰۰)
قیمت : ۱۰۰ روپے
سالِ اشاعت : ۲۰۱۲ء

ZINDAGI TERE LIYE
(SHORT STORIES)
Writer : **Dr. Qamar Jahan**

First Edition: **2012** Price: **Rs. 100/-**

ملنے کے پتے:

- صالحہ بک ٹریڈرس، نزد جامع مسجد، مومن پورہ، ناگپور/۴۴۰۰۱۸
- مدیر قرطاس، آغوش مریم، قبرستان روڈ، مومن پورہ، ناگپور/۱۸
- مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی

انتساب

والدہ مرحومہ

زینب خاتون

کے نام

جن کی تربیت نے میری شخصیت
سازی میں اہم رول ادا کیا ہے

مشمولات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ چند

سنا ہے شاعر پیدا ہوتے ہیں، بنتے نہیں۔ یہی مقولہ افسانہ نگار پر بھی صادق آتا ہے۔ مختلف مصروفیات کے سبب کئی مرتبہ میں نے سوچا کہ افسانہ نگاری ترک کردوں لیکن جب کوئی ایسا واقعہ میرے اطراف رونما ہوا، جس نے مجھے متاثر کیا تو میرا قلم اسے صفحۂ قرطاس پر اتارنے کے لیے بے قابو ہوگیا۔ میں نے اسے سماج کے سامنے پیش کرنا اپنی ذمہ داری سمجھا۔ اسی جذبے کے تحت میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''زندگی تیرے لیے'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس مجموعے کی اکثر کہانیوں میں، میں نے اپنے اردگرد پیش آنے والے واقعات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان افسانوں میں میری کوشش یہی رہی ہے کہ سماج کی سچی تصویر پیش کرسکوں۔

کہانیاں لکھنے کا شوق مجھے اس زمانے سے رہا جب میں حسامیہ گرلز ہائی اسکول کی طالبہ تھی۔ میں اساتذہ کے دئے مضمون افسانوی انداز میں لکھا کرتی تھی، جسے میرے اساتذہ نے ہمیشہ سراہا اور مجھ کو آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ایل اے ڈی کالج میں دوران ملازمت، اردو اور فارسی شعبے کے تحت منعقدہ تقریبات بھی میری تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ اسی میں فری اردو کوچنگ کلاسیس بھی شامل ہیں۔ میری کوشش یہی رہی ہے کہ افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ پاکیزگی بھی ہو اور میری یہ تحریریں ہر عمر کے لوگ پڑھ سکیں اور میں سماج کو کچھ دے سکوں۔ میں بہار اردو اکادمی اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادیمی کی ممنون ہوں کہ

میرے اولین افسانوی مجموعے ''دھوپ چھاؤں'' کو ایوارڈ سے نوازا اور میری تحریروں کی پذیرائی کی۔ ان افسانوں کو کتابی شکل دینے میں میرے شریکِ حیات پروفیسر ڈاکٹر عباس علی صاحب (سابق صدر شعبۂ عربی، وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور) کی کوششوں کو میں فراموش نہیں کر سکتی۔ ان ہی کی محنت کے سبب بکھرے ہوئے افسانوں نے کتابی شکل اختیار کی۔

میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب، محمد امین الدین صاحب (مدیر ماہنامہ قرطاس ناگپور) اور ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اس کتاب سے متعلق اپنے گراں قدر خیالات اور تاثرات سے نوازا۔

معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر مجھے مفید مشوروں سے نوازا اور کتاب کی ترتیب واشاعت میں بھی میری رہنمائی کی۔

میرے افسانے اردو کے علاوہ ہندی اخباروں اور رسالوں میں بھی شائع ہوئے جنھیں پڑھ کر قارئین نے پسندیدگی کا اظہار کیا، میں ان سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

میرے کئی کرم فرما ہیں جنھوں نے میری تحریروں کو پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی اور اسے کتابی شکل دینے پر اکساتے رہے ان میں ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر مدحت الاختر صاحب، ڈاکٹر محمد اشفاق صاحب، عبدالوحید واحد صاحب، محترمہ فاطمہ جاوید، ڈاکٹر طاہرہ وقار، ڈاکٹر خالدہ نگار اور فرزانہ اسد کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں، ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے بچوں ارشد، ثروت اور عاطف کا ذکر نہ کروں جو میرے تخلیقی کاموں میں ہمیشہ میرے مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

آخر میں دعا کے لیے خواست گار ہوں کہ خدا مجھے صحت وتندرستی عطا کرے کہ میں اپنے خیالات واحساسات کو الفاظ کی شکل دے کر زبان وادب کی خدمت کر سکوں۔

ناگپور

مورخہ: ۱۰/اپریل ۲۰۱۲ء

ڈاکٹر قمر جہاں

پیش لفظ

اردو زبان میں مختصر افسانے کا سفر کافی طویل ہے۔ فن افسانہ نگاری کو فروغ دینے میں خواتین قلمکاروں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ایسی ہی ایک خاتون افسانہ نگار نا گپور کی ڈاکٹر قمر جہاں ہیں۔ ان سے میرے مراسم گذشتہ تیس سالوں سے ہیں۔ انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے والہانہ محبت ہے۔ میں نے ہمیشہ ان سے ایک بڑی بہن کی شفقت و محبت پائی۔ ان کی سادگی، منکسر المزاجی اور خلوص نے مجھے متاثر کیا۔ وہ مقناطیسی ایسی قوت کی حامل ہیں جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور میں بھی ایک قلمکار ہونے کے ناطے ان کے قریب تر ہوتی گئی۔

ڈاکٹر قمر جہاں گذشتہ کئی سالوں سے لکھ رہی ہیں۔ افسانہ نگاری میں انھوں نے وسط ہند میں کافی نام کمایا ہے اور آج ڈاکٹر بانو سرتاج، ثریا صولت حسین، ڈاکٹر قمر جہاں اور میں ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی کا شمار و دربھ کی نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اللہ ڈاکٹر بانو سرتاج، ثریا صولت حسین اور ڈاکٹر قمر جہاں کو طویل عمر دے اور صحت مند و تندرست رکھے۔

ڈاکٹر قمر جہاں نے اپنے افسانوں میں اپنے کمالات فکر و فن اور مشاہدات کے رنگ بکھیر کر شائقین افسانہ کی نظروں کو مسرور اور دلوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقت، سچائی، کرب اور حالات زندگی کے ساتھ ساتھ سماج کے

نشیب وفراز کی عکاسی صاف نظر آجاتی ہے۔ حقیقت پسندی ان کے افسانوں کی اہم خوبی ہے۔

''دھوپ چھاؤں'' ان کے افسانوں کا ایک خوب صورت مجموعہ ہے۔ جسے ۲۰۰۵ء سال کے لیے مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی نے انعام سے نوازا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰ر افسانوں پر مشتمل ہے۔

صنف ادب میں شاعری کے بعد افسانہ ہی ایک ایسی صنف ہے جو دل کو فرحت، خوشی اور تازگی دیتا ہے۔ افسانہ انسانی زندگی پر بڑا اثر انگیز ثابت ہوتا ہے کیونکہ انسانی زندگی خود ایک افسانہ کی مانند ہے۔ چونکہ افسانہ نگار اپنے گرد و پیش کے حالات، فطرتِ انسانی اور واردات قلبی کی حقیقی تصویروں کو اپنے افسانوں میں سموتا ہے۔ اس لیے افسانوں کی جاذبیت بہت جلد اثر کر جاتی ہے۔ حالانکہ اردو میں کچھ افسانہ نگاروں نے دوسری زبانوں کے افسانوں کے ترجمے اور عریانیت کو اپنا شیوہ بنالیا ہے۔ مساوات اور سماج کے بگڑتے ہوئے خدوخال کو اپنی قلم کا محور بنایا ہے۔

قمر جہاں ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا ہے۔ انہیں سماج کے گھناؤنے پن سے نفرت ہے۔ شادی بیاہ میں تجارتی نقطۂ نظر اور جہیز کے نام پر بھاری لین دین کی وہ سخت مخالف ہیں۔

دوران طالب علمی ہی سے ان میں افسانہ نویسی کی خداداد صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔ سماجی حالات اور اپنے گرد و پیش کے حالات کو وہ افسانوں میں سموتی رہیں۔ جہاں کہیں بھی ظلم و جبر کا حادثہ پیش آتا ہے ان کا قلم تڑپ اٹھتا ہے۔

انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانوں کی مکاری، خودغرضی اور ہوس پرستی کو بے نقاب کیا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے واقعات و حادثات سے ان کے افسانوں کا خوبصورت ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو انھوں نے اپنے افسانوں کا مرکزی دائرہ بنایا ہے۔ وہ بڑی سچائی اور ایمانداری سے اپنی قلم کا استعمال کرتی ہیں۔ زندگی کے

درپیش مسائل اور سماجی رسومات میں جکڑی ہوئی خواتین کی دل آزاری اوران کی بے بسی کوانھوں نے بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

زیرنظر افسانوی مجموعہ ''زندگی تیرے لیے'' میں شامل افسانے جیتی جاگتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں زندگی کے حقائق کے ساتھ ساتھ عصری آگہی اور فکر کی بالیدگی موجود ہے۔ متعدد عنوانات کے تحت پیش کردہ افسانوں کا طرز نگارش دل پذیر، زبان سلیس اور پختہ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ بھی ''دھوپ چھاؤں'' کی طرح بے حد مقبول ہوگا۔ مجھے ایسی امید ہے۔

ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی

صدر شعبۂ اردو

وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ

آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور

ڈاکٹر شرف الدین ساحل
حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۱۸/

اظہارِ خیال

اردو افسانہ کو ترقی پسند تحریک نے اپنی آغوش میں پالا، اسے پروان چڑھایا اور اس قدر ترقی دی کہ اسے عالمی منظرنامے میں دیکھا جانے لگا۔ پھر جدیدیت کی رو نے اس کے وقار کو مجروح کیا لیکن بہت جلد اسے لایعنیت کی اس قید سے رہائی مل گئی۔ جو افسانہ نگار ۱۹۸۰ء کے بعد ابھرے انھوں نے ترقی پسندوں کی طرح سماج سے ازسرنو اپنا رشتہ جوڑا اور زر پرستوں کے ظلم و استبداد، سماج کے کمزور طبقات کے مسائل، اقتصادی بدحالی، منافقت، فسادات اور معاشرے میں پھیلی ہوئی مختلف برائیوں کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے خلاقانہ ذہن، ٹکنک اور اسلوب سے اس میں ایسی جان و توانائی پیدا کی کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آج کا افسانہ دراصل سماج کی خوبیوں اور خامیوں، رسم و رواج کی لعنت، اہلِ زر کے ظلم و ستم، ہوس پرستی اور کرب تنہائی کا عکاس ہے۔ گویا اب پورا انسانی معاشرہ اس کے دائرے میں سمٹ آیا ہے۔

ناگپور کی اعلا تعلیم یافتہ خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر قمر جہاں کا شمار اسی آخری دور کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں۔ ایل اے ڈی کالج ناگپور میں تقریباً ۲۸ سال سے فارسی زبان و ادب کا درس دے رہی ہیں۔ انھیں طالب علمی کے زمانے میں ہی افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اس میں اس قدر مشق کی کہ صاحبِ تصنیف بن گئیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دھوپ چھاؤں'' کے عنوان سے

شائع ہوا۔اب دوسرا مجموعہ ''زندگی تیرے لیے'' منظرعام پر آرہا ہے۔
قمر جہاں کے افسانے سماجی حقائق کے تناظر میں ہیں۔ان کا تانابانا آئے دن رونما ہونے والے واقعات وحادثات سے تیار ہوا ہے۔انھوں نے حسد، انتقام، عیاشی، ریاکاری، غروراور مفادپرستی کے قبیح نتائج کو حسن وخوبی سے پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ اولاد پر باپ کی زبردست سختی کا کیا اثر ہوتا ہےاور خواہش نفس کی تکمیل کے لیے انسان کس درجہ گر جاتا ہے اس کو بھی نمایاں کیا ہے۔اس کتاب میں شامل افسانوں میں زیادہ تر عورتوں کی وہ اچھی اور بری نفسیات نظر آتی ہے جوان کی زندگی کو مسرت و شادمانی یارنج وغم کے حوالے کرتی ہے۔البتہ افسانہ ''بوجھ'' ایک ایسا افسانہ ہے جو ادیب وشاعر کی خوش فہمی اوراردو معاشرے کی زبوں حالی کا منظرنامہ پیش کرتا ہے۔یہ اوراس قسم کے کئی سماجی مسائل ہیں جو کتاب میں شامل افسانوں کی تخلیق کا باعث ہیں۔یہ حقیقت کے ترجمان ہیں اس لیے پرتاثیر ہیں۔قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔امید ہے کہ ادبی حلقہ میں اس کتاب کو پسند کیا جائے گا۔

محمد امین الدین
آغوش مریم، قبرستان روڈ، مومن پورہ، ناگپور

قمر جہاں: ناگپور کی ایک اہم افسانہ نگار

ریاست مہاراشٹر میں ممبئی، پونہ، اورنگ آباد جو ایک تعلیمی مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں وہیں ناگپور کی بھی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ ناگپور جو کبھی سی پی اینڈ برار کا دارالسلطنت تھا مہاراشٹر کی تشکیل نو کے بعد اسے دوسری راجدھانی کا درجہ دیا گیا اور وہ تمام سہولتیں فراہم کی گئیں جس کی ضرورت تھی۔ یہاں اردو ذریعۂ تعلیم سے بے شمار پرائمری، ہائی اسکول اور جونیئر کالج چل رہے ہیں۔ ساتھ ہی مختلف ڈگری کالجوں میں اردو، فارسی اور عربی کے شعبہ بھی قائم ہیں۔

ڈاکٹر قمر جہاں ایل اے ڈی کالج میں اردو اور فارسی کے شعبہ میں صدر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ انھیں طالب علمی کے زمانے سے ہی مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے اور تقاریر کے مقابلے میں حصہ لینے کا شوق تھا اور یہ شوق بڑھتی عمر کے ساتھ پختہ ہوا۔ آج قمر جہاں شہر ناگپور کی ایک بہترین اور کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ''دھوپ چھاؤں'' آپ کا پہلا مجموعہ چند سال قبل اشاعتی مراحل سے گزرا، جسے مختلف اردو اکادمیوں نے انعام سے نوازا۔

ڈاکٹر قمر جہاں کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''زندگی تیرے لیے'' اشاعتی مرحلہ میں ہے۔ اس افسانوی مجموعہ میں کل ۱۵؍افسانے شریک ہیں۔ جن کے عنوان اس طرح ہیں:
(۱) زندگی تیرے لیے، (۲) گنہ گار، (۳) مجبوری، (۴) اور جام ٹوٹ گیا، (۵)

بوجھ، (۶) انتظار، (۷) وہ نہیں میں، (۸) شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، (۹) دعا، (۱۰) یادیں، (۱۱) احساس، (۱۲) شہرت، (۱۳) تڑپ، (۱۴) امن، (۱۵) ندامت۔ ان تمام افسانوں میں موصوفہ نے سماج میں رونما ہونے والے واقعات کو احاطہ تحریر میں لایا ہے جیسے عورتوں پر سماج میں ہونے والے واقعات، ان کا استحصال، دورترقی میں والدین کی عدم توجہی، بزرگوں کی ناقدری اور اس طرح کے تمام واقعات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

افسانے کے تمام کردار انھوں نے اپنے گردوپیش ہونے والے واقعات سے اٹھائے ہیں، نیز ان واقعات کو ہم کس طرح حل کر سکتے ہیں ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اصلاح معاشرہ کو موضوع بنا کر اپنے بیشتر افسانے تخلیق کئے ہیں جو وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں اگر ہمارا معاشرہ ان تمام برائیوں سے پاک ہوگا تو ہم امن چین سے اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔ جہاں ہمدردی، قومی یک جہتی کی فضا قائم رہے گی۔ ورنہ معاشرہ انتشار واختلاف کا شکار رہے گا۔ اس پیغام کو سماج میں پہنچانے میں وہ حد درجہ کامیاب رہی ہیں۔

ناگپور کی مسلم افسانہ نگار خواتین میں جن کے افسانوی مجموعے اشاعتی مراحل سے گزر کر خاص وعام میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ان میں ڈاکٹر سروشہ نسرین، صفیہ سلطانہ، کلثوم ممتاز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''زندگی تیرے لیے'' آپ کے ایک افسانے کا موضوع ہے۔ جس میں مصنفہ نے شوہر کے عزیز ترین دوست کی رحلت، اس پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی کا ذکر بہت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ تعزیت کے لیے ان کے گھر پہنچ کر وہاں کے حالات کا جب جائزہ لیا گیا تو انھیں افسوس ہوا جہاں سے وہ فوراً اپنے شہر لوٹ آیا۔

اس کتاب کا دوسرا افسانہ ''گنہ گار'' ہے۔ جس میں مصنفہ نے ان حالات کی عکاسی ہے۔ جو اکثر رونما ہوتے ہیں۔ عورت مرد کے دام فریب میں پھنس کر اس کی پہلی بیوی

کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر لیتی ہے۔ بعد میں جو انجام ہوتا ہے خود کو گنہ گار گردانتی ہے۔

افسانہ ''مجبوری'' میں ایک زمیندار گھرانے کی کہانی زیرِ بحث ہے۔ جو دولت کی فراوانی کی وجہ سے علم کی دولت سے محروم ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حالات کا شکار ہیں۔ تعلیم کی اہمیت وافادیت کو سمجھاتے ہوئے وہ اپنے افسانے کا اختتام ان جملوں پر کرتی ہیں:

''سماج یہ سمجھتا ہے کہ بے روزگاری اور غربت تو صرف سڑک پہ بھیک مانگتے، فقیروں اور آواز لگا کر دروازے کھٹکھٹانے والوں کی میراث ہے۔''

افسانہ ''بوجھ'' میں ایک ادیب کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے بے حد پریشان ہے لیکن اس پریشانی کا حل اس کی بیوی اپنے زیورات فروخت کر کے اس رقم سے کتاب کی اشاعت پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ لیکن اردو معاشرہ میں ناقدری کے حالات کا شکار ہو کر وہ حد درجہ رنج وغم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ ان حالات میں کیا ہماری زبان زندہ رہ سکتی ہے۔ جو زبان کے نام پر کچھ خرچ کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسی طرح ہر افسانے میں ان حالات وواقعات کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی ہیں جس کا ہمارا معاشرہ شکار ہے۔ ان تمام افسانوں کو پڑھ کر ہمارے قاری محظوظ ہوں گے نیز ان کا حل نکالنے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔

آخر میں اس کتاب کی اشاعت پر مصنفہ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب کی پذیرائی ہو اور افسانوی ادب میں بہتر مقام حاصل کر پائے۔

زندگی تیرے لیے

زندگی تیرے لیے

شام کا وقت تھا۔ درختوں اور بلند عمارتوں کے پیچھے سے سورج اپنی کرنیں دامن میں سمیٹے الوداع کہہ رہا تھا۔ محلے کی تمام مساجد سے یکے بعد دیگرے اذانوں کی آوازیں آرہی تھیں لیکن گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا میری بیوی دلکش آج خلاف معمول چہرے پر افسردگی لیے میرے پاس آئی اور خاموشی سے میرے ہاتھ میں ٹیلی گرام تھماتے ہوئے کہا: ''متین بھائی! اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اپنے غم پر قابو پاتے ہوئے اسے تسلی دی اور دل پر غم کا بوجھ لیے تیاری میں مصروف ہو گیا۔

ٹیلی گرام میں لکھی ہوئی سطروں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا، پڑھتا رہا۔ کیا میرا عزیز دوست متین مجھے داغ مفارقت دے گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: ''افسوس کہ میرے دوست کے اس سانحہ کی خبر مجھے پندرہ دن بعد معلوم ہو رہی ہے۔ کیا مجھے ابھی اسی وقت کوئی ٹرین یا بس مل سکتی ہے۔'' میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دلکش نے مجھے صلاح دی، بہتر یہی ہوگا کہ آپ کل صبح کی ٹرین سے چلے جائیں۔

اورنگ آباد کے پہنچتے ہی متین کے ساتھ گذارے ہوئے دن مجھے یاد آنے لگے۔ متین میرا جگری دوست تھا۔ وہ میرے لیے بھائی سے بھی بڑھ کر تھا۔ کتنا سیدھا، سچا،

ایماندار، بغیر کسی غرض کے ہر ایک کی مدد کے لیے کوشاں۔ میں اکثر اس کی معصومیت پر اسے ٹوکتا رہتا تھا: ''یار تمھیں کیا پڑی ہے کہ تم نے ہر ایک کو انصاف دلانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ جیسا چلتا ہے چلنے دیا کرو۔ کیوں بے خطر ہو کر ہر ایک کے معاملے میں کود پڑتے ہو۔''

لیکن جواب میں وہ یہی کہتا: ''نہیں مجھ سے ناانصافی برداشت نہیں ہوتی۔ میں بھی لوگوں کی طرح موٹی چمڑی کا ہو جاؤں، یہ میرا ضمیر گوارہ نہیں کرتا۔ کچھ تو لوگ ہونگے جو میرے اوصاف کی شناخت کرسکیں گے۔'' مجھے اس کے یہ جملے سن کر شک ہوتا کہیں اس کے سوچے ہوئے خواب مسمار نہ ہو جائیں۔

ٹرین میں مجھے اورنگ آباد کے رہنے والے ایک نیک شخص مل گئے تھے۔ انھوں نے مجھے متین کی موت کا تمام واقعہ سنایا کہ کس طرح نیازی صاحب کسی جھوٹے لیٹر پر متین کو دستخط کرنے پر مجبور کر رہے تھے اور وہ اپنی بات پر اٹل تھا کہ میں ہر گز اس پر دستخط نہیں کروں گا۔ بات آگے بڑھتے ہوئے تکرار کی شدید شکل اختیار کرگئی۔ متین کا بلڈ پریشر کئی دنوں سے بڑھا ہوا تھا۔ اچانک اس کے دل پر حملہ ہوا اور وہ موت کی شکل اختیار کر گیا۔ طلباء کے اطراف گھرا ہوا رہنے والا یہ متین لاش کی صورت میں گھر پہنچا دیا گیا۔ اسٹیشن سے اتر کر میں تمام راستے ماضی میں کھویا ہوا متین کے گھر جا رہا تھا۔

دراصل متین اور میں ایک کالج میں لیکچرر تھے۔ وہ ہر کام محنت لگن، ایمانداری اور جانفشانی سے انجام دیتا۔ اپنی ان خوبیوں کے باعث وہ بہت جلد سماج میں محنتی اور بے مثال ٹیچر کی حیثیت سے مقبول ہوگیا۔ متین کی یہی ہر دلعزیزی ان کے سینئر پروفیسر نیازی صاحب کو کھٹکنے لگی۔ متین کے لیے وہ بہت بڑے حاسد ثابت ہوئے۔ اس حسد کی آگ تلے ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوتے جس سے متین کو نقصان پہنچے۔ لیکن اس طرح سے کہ اس کا ذرا بھی شائبہ متین کو نہ ہوتا۔ وہ ظاہری طور پر لوگوں کی طرح

اس کی تعریف کیا کرتے۔ اس بات کو، ان کی اس ادا اور برتاؤ کو متین اور میں کئی دنوں تک سمجھ ہی نہیں سکے۔ وہ ہر وقت پرنسپل کی خوشامد میں مصروف رہتے۔ سب سے پہلے تو نیازی صاحب نے divide and rule کی پالیسی اختیار کی اور کسی طرح میرا ٹرانسفر کروا دیا۔ نیازی صاحب کی اس سازش سے میں بے خبر تھا۔ اس ٹرانسفر کو گورنمنٹ کا فرمان سمجھ کر فوراً منظور کر لیا۔

میں نے سنا کہ اس شہر سے میری روانگی کے بعد میرا دوست کچھ بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ متین میرے ٹرانسفر کے بعد ہر خط میں میری غیر موجودگی اور کمی کا اظہار کرتا۔ اسی کے خط سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرا ٹرانسفر نیازی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ تب ہی سے نیازی صاحب اور متین کی کشیدگی بڑھتی گئی۔ متین کے لیے نیازی صاحب کا طرز سلوک کالج اور شہر کے لوگوں کو معلوم ہونے لگا۔ اب لوگوں نے دونوں کے ساتھ رہنے سہنے کا نیا رویہ، نیا روپ اختیار کیا۔ وہ متین سے نیازی صاحب کی برائیاں کرتے۔ اس سادہ دل اور جذباتی انسان کو طرح طرح سے ورغلاتے، اکساتے اور اگر کہیں سچ بولنے کی ضرورت ہوتی تو سب سے پہلے متین کو پیش کرتے...... متین اس خوش فہمی میں رہتا کہ مجھے لوگ سب سے زیادہ ایماندار اور راست گو سمجھ رہے ہیں۔ وہ کچھ کہتے وقت اور زیادہ جذباتی ہو جاتا۔ اس کی آواز بلند اور گرجدار ہو جاتی۔ دوسری جانب نیازی صاحب متین کے مزاج، اس کے نیچر سے بالکل مختلف، ایمانداری اور سچائی کی خوشبو سے بہت دور، خوبصورت انداز سے لوگوں سے کس طرح ملا جائے، کہاں کب اور کیسے لوگوں کو خوش کیا جائے اس فن میں شاید ہی کوئی اس قدر مہارت رکھتا ہو۔ شہرت کی ہوس اور اس ہوس کی خاطر جان مال دونوں چیزیں رگڑنے کو تیار۔ اس کے علاوہ وہ جب بھی متین کی شہرت کا کوئی کھلا ہوا راستہ دیکھتے فوراً اسے مسدود کرنے کے لیے جس قدر جھوٹ بول سکتے اور جو بھی غلط رویہ اختیار کرنا ہوتا کر لیتے۔

نیازی صاحب اور متین کی اس جنگ کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کا کام لوگوں نے بخوبی انجام دیا۔ جس شخص کو ان دونوں سے جو بھی کام نکالنا ہوتا وہ ایک سے دوسرے کی برائی زور شور سے کرتا۔ متین کی برائیاں سن کر نیازی صاحب خوش ہوتے۔

آٹو سے اترنے کے بعد میرا ہر قدم متین کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا متین کا گھر ابھی بھی پرسہ لینے والوں سے بھرا ہوگا۔ ہر شخص نیازی صاحب پر ملامت کر رہا ہوگا اور کچھ لوگ تو ضرور نیازی صاحب کو متین کی موت کا ذمہ دار قرار دے رہے ہوں گے۔ مجھے دیکھتے ہی متین کی بیوی متین کے ساتھ نیازی صاحب کے کئے ہوئے ہر سلوک کو رو رو کر بیان کرے گی۔ کہیں یہ سب سن کر نیازی صاحب کے خلاف میرے بھی جذبات بھڑک نہ جائیں۔ یہی اندیشہ لیے ہوئے میں متین کے گھر کے پاس پہنچا...... ''ارے یہ کیا! یہ کیسا پنڈال، کیا متین کا چالیسواں بھابی جان ابھی سے کر رہی ہیں۔'' داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ پنڈال تعزیتی جلسے کے لیے ڈالا گیا ہے یہاں شہر کی کئی معزز ہستیاں اکٹھا ہیں۔ کالج کے پرنسپل اور نیازی صاحب اسٹیج پر تشریف رکھے ہوئے ہیں۔ اب پرنسپل صاحب تقریر کے لیے اٹھے۔ بھابی نے مجھے دیکھا کہ میں کہیں نشست ڈھونڈ رہا ہوں، ہاتھ سے ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پرنسپل صاحب اپنی تقریر میں کہہ رہے تھے کہ ''متین صاحب ایک اچھے انسان تھے شاید ہی کوئی ان کی جگہ پُر کر سکے۔ میں آج نیازی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک مفید مشورہ دیا۔ ان کا یہ مشورہ میں اور شاید آپ لوگ بھی پسند کریں گے۔ وہ یہ کہ متین صاحب کے کمسن بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہم نے یہ طے کیا کہ ان کی بیوی جو بی اے پاس ہے انھیں ہم کالج میں کلرک کے عہدے پر فائز کر رہے ہیں۔''

پرنسپل صاحب کے یہ جملے سن کر متین کی بیوی مائک کے قریب آ کر کہنے لگی: ''میں

پرنسپل صاحب اور خاص طور پر نیازی صاحب کی شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے درد کو سمجھا اور مجھے یہ عہدہ دیا۔''

تمام پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ نیازی صاحب اس جلسے کے ہیرو ہو گئے۔ ہر شخص ان کی واہ واہ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا ان سب میں وہ لوگ بھی تھے جو متین کے سچے دوست اور نیازی صاحب کے مخالفین میں سے تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل زمانے کے حالات پر کڑھنے لگا۔ کسی طرح میں نے چند گھنٹے اس شہر میں گزارے اور اسی دن اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

جب میں گھر میں داخل ہوا تو دلکش مجھ سے سوال پر سوال پوچھے جا رہی تھی، ''بھابی تو بہت رو رہی ہوگی؟ اور وہ نیازی صاحب تو شہر میں کسی کو منھ دکھانے کے لائق نہ رہے ہوں گے۔''

دلکش کے ان سوالوں سے میں بے تاب ہو گیا اور سخت لہجے میں کہا: ''اب بس بھی کرو مجھ سے سوال پوچھنا۔''

دلکش میرے تیور دیکھ کر بجھ سی گئی اور بہت جلد سو گئیں۔ جب میں بستر پر پہنچا اس کے چہرے پر ابھی بھی ناراضگی جھلک رہی تھی۔ میں اپنی اس غلطی پر خود شرمسار تھا۔ کروٹیں بدل رہا تھا پھر نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ فجر کی اذان سن کر میں جاگ اٹھا اور ذہن میں رات کے دیکھے ہوئے خواب کو دہرانے لگا۔ متین ایک نہایت خوبصورت باغ میں جس کے نیچے نہریں رواں ہیں بہت خوش دلی کے ساتھ ٹہل رہا ہے۔ مجھے ایک درخت کے نیچے ساتھ میں بیٹھنے کے لیے کہا: ''ارے یار تم کیوں اس قدر غمزدہ ہو۔ دیکھو میں یہاں کتنا خوش ہوں۔ زمانہ بدلے گا، دور کروٹ لے گا، لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے بدلیں گے لیکن اللہ کا وعدہ اٹوٹ ہے وہ کبھی نہیں بدلے گا۔''

اس نے مجھے وہی دیا جو وہ کہتا ہے: ''ہم نیک اور پرہیزگاروں کے ساتھ ہیں اور انھیں ہم جنت میں داخل کریں گے۔''

میں دلکش کے پاس گیا۔ اس کے ماتھے کو چومتے ہوئے کہا: ''دلکش جلدی اٹھو فجر کا وقت ختم ہو رہا ہے، ورنہ تھوڑی دیر بعد سورج کی کرنیں پھیل جائے گی۔''

دلکش کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ میری غلطیوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ زندگی کے لیے شاید یہ سمجھوتہ ضروری بھی ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ لان میں گھانس پر پڑی شبنم پر پھیلی دھوپ مسکرا رہی تھی۔ زندگی پھر رواں دواں ہو گئی تھی۔ زندگی شاید ایسی ہی ہے۔ سب کچھ بھول کر نئے سفر کے لیے مسکراتے ہوئے چلنے کے لیے تیار...... اگر ایسا نہ ہو تو شاید زندگی باقی نہ رہے۔

OOOO
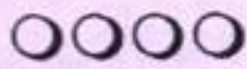
گنہ گار

اس چھوٹے سے ٹیلے اور درختوں کی آڑ سے سورج جھانک رہا تھا۔ اس ڈوبتے سورج کو دیکھ کر مجھے میرا ماضی یاد آنے لگا۔ جب میں شادی کے ایک ہفتہ بعد باسط کے ساتھ اس پر فضا مقام پچھمڑی سیر کے لیے چلی آئی تھی۔ اس موسم میں سیاحوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ باسط مجھ سے کہتے اگر نغمہ تمھیں پہاڑوں کی اوٹ سے نکلتے سورج اور صبح کی فضا میں بکھرتی ہوئی کرنوں کو دیکھنا ہے تو فوراً تیار ہو جاؤ۔ یہ سن کر میں ان کے ساتھ ہو جاتی۔ وہ راستے میں کئی شعر اور لطیفے سنا کر مجھے ہنساتے۔ واقعی ان دنوں مجھے ایسا لگتا جیسے زندگی کی تمام بہاریں، ساری خوشیاں میرے دامن میں سمٹ آئی ہیں ...... ان دنوں میں نے یہ محسوس ہی نہیں کیا کہ کسی کی خوشیاں چھینی ہیں۔ ایک عورت ہونے کے باوجود دوسری عورت پر ظلم کیا ہے۔ حق تلفی اور ناانصافی کی ہے۔

باسط اگر چہ آفس کے اعلیٰ افسر نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ دراصل میری اور باسط کی چاہت کا آغاز آفس کی چار دیواری سے ہوا۔ باسط خوش قد اور حسین وجمیل انسان تھے۔ اپنی باتوں اور اداؤں سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ مجھے آفس میں کام کرتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ باسط میری ٹائپ کی ہوئی فائلیں دیکھ کر میرے کام کی تعریف کرتے۔

ہمارے یہاں والدہ کے ساتھ ہم تین بہنیں رہتی تھیں۔ابو کے انتقال کے بعد امی زیادہ تر بیمار رہنے لگیں۔ چونکہ میں تینوں بہنوں میں بڑی تھی اس لیے گھر کی اکثر ذمہ داریاں مجھ پر عائد تھیں۔ حالانکہ میں بہت حسین نہیں تھی لیکن جاذب نظر ضرور تھی۔ لیکن اس دور میں لڑکیوں کے انتخاب کرنے کے طور طریقے بدل چکے ہیں۔ جو باتیں معیوب سمجھی جاتی تھیں اب وہ فیشن بن چکی ہیں۔ ہر کوئی حسن کی شناخت میں سفید گورے رنگ کو ترجیح دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے دو سال تک متواتر رشتے آتے رہے لیکن کسی اچھے خاندان کی نظر مجھ پر نہ ٹھہری۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مجھ جیسے معمولی خاندان سے رشتہ جوڑ کر ان کی توقعات پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ موجودہ دور کے انتخاب کے ان طریقوں سے میں تنگ آچکی تھی۔ میں ابو کی زندگی میں بی کام کر چکی تھی اور میں نے ملازمت حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ ٹائپنگ اور کمپیوٹر کے دو تین کورس کر ڈالے جس کی وجہ سے مجھے اچھی ملازمت مل گئی۔

اب باسط میرے کام کے ساتھ ساتھ میرے جاذب چہرے کے گیت دھیمے سروں میں گنگنانے لگے۔ ابتدا میں ان کی اس حرکت سے میں جھینپ جاتی اور کچھ ناراضگی کا اظہار بھی کرتی۔ ایک مرتبہ امی کی طبیعت زیادہ خراب رہی۔ میں دو تین دن آفس نہیں جا سکی۔ باسط نے میرے نہ آنے کی وجہ دریافت کی اور اسی شام گھر پوچھتے پوچھتے پھلوں کی سوغات کے ساتھ گھر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں امی سے کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ امی اپنی آدھی بیماری بھول گئیں۔ بار بار کہہ رہے تھے اس گھر کو آپ کی بیٹیوں نے کس خوبی سے سجائے رکھا ہے۔ کتنا سکون ہے خالہ جان آپ کے گھر میں۔ ایک میں ہوں جب بھی آفس سے گھر لوٹتا ہوں بے ترتیب سامان دیکھ کر الجھن سی ہونے لگتی ہے اور پھر دوسری بد نصیبی یہ کہ راحلہ ہر وقت لڑنے پر کمر بستہ رہتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کہاں جاؤں۔ امی باسط کی باتیں سنتی رہیں اور پھر بے انتہا

دعاؤں کے ساتھ باسط کو رخصت کیا۔
اس طرح امی کی طبیعت دیکھنے کے بہانے اکثر باسط گھر آنے لگے۔ باہر کے کاموں کی اکثر ذمہ داریاں خود سنبھالنے لگے۔ اس طرح انھوں نے میری حساس والدہ کو اپنے حسن سلوک سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ امّی اور میں اپنی نیک دلی اور سادگی کے باعث یہ نہیں سمجھ سکے کہ یہ سب باسط کی ریا کاری اور دکھاوا ہے۔ دراصل اپنے گھر کے بگاڑ کا باعث وہ خود ہے۔
آخر ایک دن باسط نے امّی کو اچھے موڈ میں دیکھتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی:
''خالہ جان مجھ پر رحم کیجیے، مجھ پر یقین کیجیے۔ نغمہ کو میں کسی قسم کی تکلیف نہیں دونگا۔ اگر آپ کہیں تو میں اسے علیحدہ لے کر رہوں گا......''
ایک دن آفس سے نکلتے وقت باسط کار لیے میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگے: ''ہم نے سنا ہے کہ آج آپ شاپنگ کے لیے جارہی ہیں...... چلئے ہمیں بھی وہیں جانا ہے۔''
پھر میرے ساتھ ہر جگہ رک رک کر میرے منع کرنے کے باوجود شاپنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب رات ہونے لگی اور میں نے گھبراہٹ کے ساتھ گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا: ''میں یہاں سے آٹو لے لونگی۔''
یہ سن کر باسط نے نہایت اپنائیت سے کہا: ''ہم رات گئے ایک لڑکی کا تنہا گھر لوٹنا پسند نہیں کرتے...... چلئے ہم ساتھ چلتے ہیں۔''
یہ الفاظ باسط نے کچھ ایسے انداز میں ادا کئے جیسے عورتوں کی عزت ان کے رگ و پے میں بسی ہے۔ بس اس دن میں ان کی اس ادا پر فدا ہوگئی۔ امی کے اصرار کو اقرار میں بدل دیا۔ اس وقت میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ باسط کی پہلی بیوی سے ملوں۔ ان کے گھر کے تناؤ بھرے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کروں کہ آخر اس تناؤ کا سبب کیا ہے۔ دنیا

ہمیشہ سچ کہتی ہیں کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر چہ باسط کی بیوی مغرور اور تمکنت والی ہے۔ وہ ہر وقت لڑنے پر آمادہ رہتی ہے۔ اس میں باسط کا بھی کچھ نہ کچھ قصور ضرور ہوگا۔

اب سلمیٰ بھی بی ایس سی کر چکی تھی اور ملازمت میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس سال اس کا بی ایڈ کرنے کا ارادہ تھا۔ اب مجھے گھر کی ذمہ داریاں آسان نظر آنے لگیں۔ باسط سے شادی کے لیے مجھے رضامند دیکھ کر امی بے فکر اور صحت مند نظر آنے لگیں۔

ایک دن شام میں باسط، مولوی صاحب اور چند دوستوں کے ساتھ گھر تشریف لائے اور ان ہی چند لوگوں کی موجودگی میں میرا نکاح ہوگیا۔ باسط مجھے علیحدہ لے کر رہنے لگے۔ ابتدا میں انھوں نے چاہت لٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس چاہت اور اپنائیت کے باعث میں نے لوگوں کے چہرے اور طنزیہ جملے برداشت کیے اور اپنی زندگی سنوارنے میں جٹ گئی۔ لیکن کتنی عجیب و غریب بات تھی کہ باسط نے اپنی پہلی بیوی کو فساد پسند اور منہ زور قرار دیا تھا لیکن وہ ایک خاندانی لڑکی تھی۔ شروع میں وہ بھی دیگر عورتوں کی طرح اپنے شوہر کے عیب چھپاتی رہی لیکن جب عورتوں کے تعلق سے اس نے اپنے شوہر کے ڈگمگاتے قدم دیکھے تو آہستہ آہستہ وہ باسط پر شک کرنے لگی۔ میری شادی کے وقت وہ پتھر کی مورت بنی رہی۔ خاموشی سے تماشائی بن کر سب کچھ سہتی رہی، سب کچھ دیکھتی رہی۔

میری شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔ ہم دونوں خوشگوار زندگی جی رہے تھے۔ میں کچھ مہینے بعد باسط کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میری صحت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے آرام کی صلاح دی۔ باسط نے نہایت خلوص و اپنائیت سے مجھ سے کہا: ”نغمہ ان آخری مہینوں میں بہتر ہوگا کہ تم امی کے گھر جا کر آرام کرو۔ میں آفس سے تمہاری چھٹیوں کا انتظام کر دوں گا۔“

مجھے باسط کا مشورہ درست لگا اور میں امی کے یہاں چلی آئی۔ یہاں باسط دنوں کے وقفے سے آتے۔ پھر ہفتوں اور مہینوں کے وقفے سے آنے لگے۔ ابھی بچہ کی پیدائش میں صرف ایک مہینہ باقی تھا۔ لیکن اب باسط نے میری خبر لینی چھوڑ دی۔ میرا دل کانپنے لگا۔ دماغ میں کئی طرح کے خیالات آنے لگے۔ میرے گھر کی کام والی خالہ باسط کے کردار سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ اکثر کہتی تھیں دیکھو نغمہ بی بی تم کبھی کسی جوان لڑکی کو اپنے گھر میں ملازم نہ رکھنا۔ تمہارے شوہر کچھ الگ قسم کے انسان ہے۔ اسی بات پر تو ان کی پہلی بیوی سے کبھی نہیں بنی۔ دو بچوں کو لیے بے چاری اپنے میکے میں بیٹھی ہے۔

اسی دوران اچانک سلمٰی تیز تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوئی اور مجھے سوتا ہوا سمجھ کر امی سے ہانپتے ہوئے بلند آواز میں کہنے لگی: ''امی ہماری نغمہ باجی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا...... باسط بھائی صاحب میری سہیلی کی خالہ سے آج شام نکاح کر رہے ہیں۔ وہی جو کئی دنوں سے بھائی صاحب کے ساتھ کار میں ساتھ بیٹھی نظر آ رہی تھیں......''

ان تلخ الفاظ کو میں نے زہر کے گھونٹ کی طرح پی لیا۔ اس حادثہ کا میرے دماغ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہو جائے اس لیے بچہ کی خاطر سب کچھ خاموشی سے سہہ لیا۔ آہستہ آہستہ اپنے آپ سے کہنے لگی مجھے بچہ کی خاطر جینا ہوگا۔ اگر چہ باسط عیاش اور غلط راہ پر چلنے والے شخص تھے تو میں بھی کچھ کم گنہگار نہیں...... میں نے ایک عورت ہونے کے باوجود یہ جاننا ضروری نہیں سمجھا کہ ایک تندرست، خوبصورت اور بھلے خاندان کی عورت جو دو بچوں کی ماں ہے ان سب کے ہوتے ہوئے آخر باسط مجھ سے دوسری شادی کیوں کر رہے ہیں...... یہ صحیح ہے کہ اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے لیکن کن حالات اور کن شرائط پر...... یہ عیش پرست مرد جو اپنی عیاشی کو چاہت کا غلاف پہنا کر بے سہارا معصوم لڑکیوں کو برباد کرتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ اسلام نے ہر بیوی کے

ساتھ برابری کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔
اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک عورت ہی دوسری عورت کی زندگی برباد کرتی ہے۔ وہ مرد کو دوسری شادی کرتے ہوئے دیکھ کر کیوں نہیں سمجھتی جس طرح اس مرد نے بغیر کسی سبب کے پہلی بیوی کو چھوڑا ایک دن اسے بھی چھوڑ سکتا ہے...... آہستہ آہستہ امّی بوجھل قدموں سے میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میری پیشانی کو چوما۔ وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میری آنکھوں سے اشک بہنے لگے اور میں نے آہستہ سے کہا: ''ہاں امّی! سلمٰی نے جو کچھ تم سے کہا میں نے سب کچھ سن لیا۔ میں بدنصیب تو ہوں لیکن ساتھ ہی باسط کی بیوی کی گنہگار بھی ہوں۔

○○○○

مجبوری

اگر ہم فہمیدہ کے ماضی کے ورق گردانی کریں تو دیکھیں گے وہ ایک دور میں کوئی معمولی عورت نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق ایک امیر اور بارسوخ خاندان سے تھا۔ اس کے خسر کے والد ایک زمانے میں بہت بڑے زمیندار ہوا کرتے تھے۔ ان کے یہاں ہر کام کے لیے نوکروں کی قطار موجود تھی۔ ہر کام منٹوں میں آسانی سے ہو جاتا تھا۔
لیکن اس خاندان کی مجبوری یہ رہی کہ آنے والی نسل تعلیم سے محروم رہی اور نہ ہی انھوں نے کوئی ہنر سیکھا۔ بزرگ بھی یہ سمجھ کر اپنے آپ کو تسلی دیتے رہے کہ ہمارے بیٹوں اور پوتوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا ضروری بھی نہیں۔ اللہ نے ہمیں ہر طرح سے نوازا ہے پھر کیوں ان کی اولادیں دوسروں کے یہاں کام کریں جب کہ خود ان کے گھر درجنوں ملازم موجود ہیں۔
اس خاندان میں چھوٹے موٹے پروگرام بھی اعلیٰ پیمانے پر ہوتے۔ ہر تقریب میں کئی قسم کی سجاوٹ اور کئی طرح کے لوازمات کا اہتمام ہوتا۔ ہر شخص زمیندار صاحب کے یہاں سیر ہو کر کھانا کھاتا اور لوٹتے وقت ان کی مدح میں مشغول رہتا۔ زمیندار صاحب اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے اور مہمان کے لوٹتے وقت اپنی خاندان میں ہونے والی دوسری تقریبات کے بارے میں بتاتے۔ لیکن لوگوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی

کہ ان تمام تقریبات کا انتظام زمیندار صاحب کے یہاں کیسے ہوتا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کی زمین جائداد فروخت کر کے اپنی ضرورتیں پوری کر رہے تھے۔

فہمیدہ کے یہاں زمیندار صاحب کے پوتے کا رشتہ آیا۔ فہمیدہ کے والد ایک غریب انسان تھے۔ وہ مکان تعمیر کیا کرتے تھے۔ لوگ انہیں مستری نام سے پکارا کرتے۔ اپنی بیوی سے کہنے لگے ہمیں اس رشتے کے بارے میں کیا سوچنا، کیا دیکھنا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ زمیندار صاحب کے یہاں کا رشتہ مجھ جیسے غریب آدمی کے یہاں آیا ہے۔ میری کیا حیثیت ہے۔ میں ایک معمولی مستری ہوں۔ تم تو اس خاندان کے بارے میں خوب جانتی ہو۔ جب بھی کوئی شادی ہوتی ہے پورا شہر اکٹھا ہوتا ہے۔ زمیندار صاحب کی دونوں بیٹیوں کی شادیاں کتنی دھوم دھام سے ہوئیں۔ کتنا شور وغل تھا۔ کئی دنوں تک لوگ ان شادیوں کے انتظامات اور جہیز کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

اگر چہ لڑکا بہت تعلیم یافتہ نہیں ہے اور نہ کسی کمپنی میں ملازم ہے...... لیکن کار ڈرائیونگ میں ماہر ہے۔ تب ہی تو جج صاحب نے اسے اپنے یہاں ڈرائیور رکھ لیا۔ پھر ہماری فہمیدہ بھی بہت تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ صرف میٹرک پاس ہے۔ تھوڑی بہت سلائی کڑھائی جانتی ہے اور پھر ہمارے خاندان میں اس کے لائق کوئی لڑکا ہے بھی نہیں۔ اس کے لیے یہ رشتہ نہایت مناسب ہے۔ یہ بات بھی ہمارے لیے کتنی اچھی ہے کہ زمیندار صاحب کی بہو نے خود مجھ سے کہا کہ ہم اس شادی کا انتظام دونوں طرف سے کریں گے۔ آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں۔ میں ضعیف انسان۔ مجھے تو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میں نے بڑی بیٹی رضیہ کی شادی کے لیے جو قرض لیا تھا اسے اب تک ادا نہیں کر پایا ہوں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ فہمیدہ کے سسرال والے ہم پر کسی قسم کا بوجھ نہیں لا د رہے ہیں۔ اس طرح اپنی بیوی کو سمجھا بجھا کر اس رشتہ کے لیے راضی

کرلیا۔ والدین نے اس رشتہ کے لیے فہمیدہ کی مرضی جاننا ضروری نہیں سمجھا۔ فہمیدہ کی والدہ جو اپنے شوہر کی بہ نسبت عمر میں کافی کم تھی خاموشی سے شوہر کی بات مانتی رہی، اس طرح فہمیدہ کی چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ اس شادی میں بھی زمیندار صاحب کے بیٹے نے جائداد کا کچھ حصہ بیچ کر اپنے خاندانی وقار کو قائم رکھا۔ فہمیدہ کے لیے قیمتی زیورات اور پوشاکیں خریدی گئیں۔

فہمیدہ نے دلہن کے روپ میں اس باوقار خاندان میں قدم رکھا۔ کئی دنوں تک زمیندار صاحب کے یہاں شادی کی گہما گہمی رہی۔ لوگ آتے جاتے رہے۔ ہر کسی نے دلہن کی خوبصورتی کو سراہا۔ دراصل فہمیدہ کی خوبصورتی ہی اس خاندان کی بہو بننے کا سبب تھی۔ فہمیدہ پر اس کے بچپن سے ہی زمیندار صاحب کے خاندان کی خواتین کی نظریں ٹکی تھیں۔ جب وہ اسکول جانے کے لیے اپنے چھوٹے سے گھر کا دروازہ بند کرنے کے لیے اپنی والدہ کو آواز دیتی اس وقت کوٹھی کی خواتین اپنے اپنے کمروں سے باہر آکر اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتیں اور اسے کوٹھی میں بیاہ لانے کا سپنا سجاتیں۔

فہمیدہ جب کچھ بڑی ہوگئی۔ کوٹھی والوں کا یہ حال دیکھا تو شرما کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ جاتی...... جس وقت فہمیدہ کی شادی ہوئی تھی اس وقت سسرال میں فارغ البالی تھی ہر طرح کا آرام تھا۔ خاندان کے سب لوگ ساتھ مل کر رہتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں کے مزاج بدلنے لگے۔ ساتھ میں رہنے والے لوگ اپنے اپنے طور پر اس کوٹھی میں علیحدہ ہوتے گئے۔ اس کوٹھی میں ہر ایک کے پاس دو تین کمروں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہی ان کا کل گھر تھا۔ وہی ڈرائنگ روم، وہی باورچی خانہ، سب کچھ وہی تھا۔ فہمیدہ کے شوہر بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس لیے والدہ کی ذمہ داری ان کی تھی۔ یوں بھی تمام بہوؤں میں فہمیدہ ہی زیادہ فرماں بردار اور خدمت کا

جذبہ رکھتی تھی اس لیے ساس نے اس کے پاس رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔
فہمیدہ کے شوہر باقاعدگی کے ساتھ جج صاحب کے یہاں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے۔ محدود آمدنی میں فہمیدہ مہینے کے اخراجات بڑی کفایت شعاری سے نبھاتی رہی۔

ایک دن اچانک اس کے شوہر کی طبیعت بگڑ گئی۔ فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ: ''اچھا ہوا کہ آپ وقت پر لے آئے ورنہ تھوڑی دیر ہو جاتی تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ ابھی اسی وقت ان کے دل کا آپریشن کرنا ہوگا۔ ان کے دل کی خون پہنچانے والی رگیں بند ہو چکی ہیں۔ اس آپریشن کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپئے کا انتظام کرنا ہوگا۔''

اتنی بڑی رقم...... سن کر فہمیدہ کے پیروں تلے زمین کھسک گئی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور وہاں سے گھر لوٹ آئی۔ کسی بھی حال میں وہ اپنا سہاگ بچانا چاہتی تھی......
فوراً اپنے تمام زیورات نکال کر اسے فروخت کرنے کے لیے بھجوا دیا۔ آپریشن کامیاب رہا، لیکن اس آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے کئی طرح کی احتیاط برتنے کا مشورہ دیا۔ اس میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ اب آپ ڈرائیونگ نہیں کر سکتے۔ فہمیدہ کے شوہر نہ زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور نہ ہی ڈرائیونگ کے علاوہ کوئی اور ہنر جانتے تھے۔ اب انھوں نے گھر کی چار دیواری میں خود کو مقید کر لیا۔ گھر کے اخراجات کے بارے میں سوچ سوچ کر فہمیدہ پریشان تھی۔ پھر اس نے گھر کے کسی کونے میں پڑی پرانی سلائی مشین تلاش کی۔ محلے کی ایک خاتون جو سلائی کے فن میں کافی ماہر تھیں ان سے التجا کی کہ وہ کچھ سوتی کپڑے جو آسانی سے سل سکے اسے دیا کریں۔ وہ کم قیمت پر سل دیا کرے گی۔ وہ خاتون راضی ہو گئیں اور فہمیدہ سے کپڑے سلوانے لگی۔ مفلسی اور گھر کے بگڑتے حالات سے فہمیدہ کا حسن گہنا تا جا رہا تھا۔ اب نہ پہلے کی طرح بالوں کی گھٹائیں تھیں

اور نہ دمکتے چہرے پر وہ پرنور نرگسی آنکھیں۔ جو کلائیاں کبھی چوڑیوں سے بھری اور ہاتھ مہندی سے سجے ہوتے تھے اب ان ہاتھوں میں سہاگن کے نام پر دو چار کانچ کی بدرنگ چوڑیاں پڑی رہتیں۔ رات دن سلائی کے کام نے وقت سے پہلے آنکھوں پر چشمہ ضرور پہنا دیا تھا۔

فہمیدہ جس قدر اپنے نام کی طرح سمجھدار تھی اتنی ہی صابر اور شاکر بھی، لیکن بعض لوگوں کی تقدیر میں صرف دکھ جھیلنا ہی لکھا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہر طرح سے آزماتا ہے۔ لیکن اس کے صابر اور شاکر بندے کبھی اپنی زبان پر حرف شکایت نہیں لاتے۔ یہ دیکھ کر لگتا ہے کہ دنیا واقعی ایسے ہی نیک بندوں کے باعث ٹکی ہے...... فہمیدہ بھی اللہ کے انہی نیک بندوں میں سے تھی۔ بیٹے کے انتظار میں اللہ نے اسے یکے بعد دیگرے تین بیٹیوں سے نوازا۔ اس نے اپنے رب کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ جس طرح بن پڑا بچیوں کی پرورش میں کوئی کمی نہ کی۔ ان بچیوں اور اپنی ساس کے لیے اس نے خود کو وقف کر دیا اور پیشانی پر شکن نہ آنے دی......

آہستہ آہستہ محلے کی خاتون نے فہمیدہ کے پاس یہ کہہ کر کہ اب تو ہر کوئی بہترین ٹیلر کی تلاش میں ہوتا ہے کپڑے دینا بند کر دیا۔ فہمیدہ نے اب کوئی اور کام تلاش کرنا شروع کیا...... چاہا کہ کسی اسکول میں تھوڑی تنخواہ میں ہی سہی کوئی کام مل جاتا مگر اکثر اسے مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ کئی جگہ انٹرویو کے دوران لوگوں کو حیرت ہوئی کہ زمیندار صاحب کی بہو ہو۔ پھر افسوس کے ساتھ جواب مل جاتا کہ: ”آپ کے پاس کوئی بھی ٹیچرس ٹریننگ سینٹر کی ڈگری یا ڈپلومہ نہیں ہے ایسی حالت میں ہم آپ کو نہیں رکھ سکتے۔“

غرض کہ فہمیدہ نے ملازمت کے لیے مختلف اداروں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر ناکامی ہی ہوئی۔

اس کے زیورات تو پہلے ہی شوہر کی بیماری کی نذر ہو چکے تھے۔ بچیوں کی فیس ادا کرنے

میں گھر کے دیگر قیمتی سامان بھی دھیرے دھیرے فروخت کر چکی تھی۔ اب اس کے اور اس کی ساس کے پاس اثاثہ کے طور پر اس گھر کی پرانی یادیں ہی تو تھیں جواب افسانہ معلوم ہوتی تھیں...... فہمیدہ کے مائکے سے لے کر سسرال تک کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کا حال پوچھتا اور اس کی مدد کرتا۔ اس کے والد بھی اب ضعیف ہو چکے تھے۔ کمزوری کے باعث ان سے اب کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ لکڑی کے سہارے چلتے ہوئے کبھی کبھی فہمیدہ کے گھر آ جاتے۔ اس سے اس کے گھر کا حال پوچھتے۔ لیکن صابر و شاکر فہمیدہ نے ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا۔ کبھی اپنی کسمپرسی کا رونا نہیں رویا۔ اس کے والد مطمئن ہو کر بچیوں کو چاکلیٹ وغیرہ دے کر لوٹ جاتے......

اسی طرح دن گزرتے رہے۔ رمضان شریف کی آمد آمد تھی۔ فہمیدہ کی ایک پڑوسن اس کے حال پر ترس کھا کر کہیں سے ٹوپیاں، تھیلیاں وغیرہ سلنے کے لیے دے جایا کرتی تھی جبکہ وہ خود سلائی کے فن سے انجان تھی۔ لیکن اسے فہمیدہ سے بڑی انسیت تھی کیونکہ اس نے زمیندار خاندان کی امیری اور اچھا دور خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے وہ فہمیدہ کی ہمدرد اور غمگسار تھی۔ اس عورت کی دو لڑکیاں تھیں۔ وہ اور اس کی ضعیف ساس صبح سویرے مختلف گھروں میں کام کرنے نکل جایا کرتے تھے۔ کئی سالوں تک اس پڑوسن کی ساس نے کئی امیر گھرانوں میں روٹیاں پکائی تھی۔ اسے ہر کوئی خالہ کے نام سے جانتا تھا۔ ضعیفی کی وجہ سے اب اس سے زیادہ کام نہیں ہوتا تھا پھر بھی ہر کوئی اسے بن مانگے بھرپور زکوٰۃ، خیرات دے جاتا۔ اس طرح بہو اور پوتیوں کو بھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی۔ رمضان شروع ہونے کے قبل ہی اللہ کے کئی نیک بندوں نے اس کے گھر میں مہینہ بھر کا راشن بھر دیا یہ سوچ کر کہ انہیں روزے کی حالت میں کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ جوں جوں عید قریب آ رہی تھی مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے دردمند لوگ خالہ کے دروازے پر دستک دیتے اور اناج، کپڑا، روپیہ پیسہ

سے ان کی مدد کر جاتے...... دوسری جانب فہمیدہ کی بچیاں بھی اپنی ماں کے ساتھ روزہ رکھنے کے لیے بضد تھیں۔ تینوں بہنیں روزہ رکھتیں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں جب سلائی زیادہ ملنے کے امکانات تھے اچانک فہمیدہ کی سلائی مشین دغا دے گئی۔ اس بگڑی مشین کو دیکھ کر فہمیدہ یہ کہہ کر رو پڑی کہ اسے بھی ابھی بگڑنا تھا۔ محلے میں ہی ایک میکانک تھا اسے بلوانے کے لیے تین چار روز تک مسلسل فہمیدہ بچیوں کو بھیجتی رہی مگر وہ ''ابھی آیا'' کہہ کر ٹالتا رہا۔ آخر فہمیدہ جب انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو وہ خود اسے بلانے گئی۔ میکانک نے مشین دیکھ کر کہا کہ: ''اس کا ایک مخصوص پرزہ گھس چکا ہے، بدلنا ہوگا۔ پانچ سو روپے لگیں گے ورنہ مشین نہیں چلے گی۔''

مشین بند رہے گی تو سلائی کے لیے کپڑے آنا بھی بند ہو جائیں گے، یہ سوچ کر فہمیدہ نے اپنی جمع پونجی جو بچیوں کے کپڑے خریدنے کے لیے رکھی تھی اس میکانک کو دے دیئے۔

آج فہمیدہ جب سحری کے لیے اٹھی تو دیکھا ڈبہ میں دو چار روٹیوں کا ہی آٹا تھا کسی طرح جھاڑ جھٹک کر اس نے اپنے شوہر اور ساس کے لیے روٹیاں بنائیں۔ ایک روٹی میں سے بچیوں کو کھلائی اور خود صرف پانی پی کر روزہ رکھ لیا...... گھر کی دن بہ دن بگڑتی حالت کا اس نے کبھی کسی سے کوئی ذکر نہیں کیا لیکن بچیوں کے کملائے ہوئے چہرے ان کی حالت کی عکاسی کر رہے تھے......

وہ غریب پڑوسن جو گھروں میں کام کرتی تھی اس کی حالت فہمیدہ سے بدرجہا بہتر تھی کہ اس کے پاس کوئی بھرم کوئی جھوٹا وقار نہیں تھا جو اسے کسی کام کے کرنے میں رکاوٹ بنتا اور نہ ہی کوئی چھوٹا یا بڑا کام کرنے میں کوئی عار محسوس ہوتی۔ مگر فہمیدہ کے پروقار گھرانے کی طرف اللہ کے کسی نیک بندے کے قدم نہیں اٹھے کہ خاموشی سے کوئی نیکی کر جائے۔

آج شام فہمیدہ کی پڑوسن گرم گرم کھچڑی کا برتن پیچھے کے دروازے سے فہمیدہ کے گھر لے آئی یہ کہہ کر کہ: ''میرے یہاں کئی گھروں سے، جو لوگ روزہ نہیں رکھتے بطور ایصال ثواب مجھے ٹفن پہنچا جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں کھانے والے بھی دو چار لوگ ہی ہیں تم برا نہ مانو تو میں تھوڑا سالن بھی لے آئی ہوں......''

اس شام تینوں بچیوں سمیت سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد فہمیدہ کی چھوٹی بیٹی نے اپنی والدہ سے کہا: ''امی! آپ بھی پڑوسن خالہ کی طرح کام کرنے والی خالہ ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ دیکھئے نا ان کے یہاں لوگ کتنا سامان لا کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو کوئی کچھ بھی نہیں لاتا۔ ہم لوگ بھوکے ہوں گے اس کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا۔''

یہ سن کر فہمیدہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مگر جلد ہی اس نے آنسوؤں کو پونچھا اور ایک نئے عزم کے ساتھ کہنے لگی: ''ہاں بیٹا! تمہاری امی بھی اب کل سے زمیندار صاحب کی بہو نہیں بلکہ کام کرنے والی خالہ کہلائیں گی۔ کہاں ہے میرا پرانا نقاب اسے پہن کر میں کل تمہاری ٹیچر آنٹی کے گھر روٹیاں پکانے جایا کروں گی۔''

پھر فہمیدہ نے اپنے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے ایک سرد آہ بھری اور آہستہ سے کہا: ''اے اللہ تو مجھے معاف کرنا، تو ہی میری مجبوری جانتا ہے۔ میں اتنے بڑے خاندان کی بہو ہوں۔ لیکن اس خاندان میں تعلیم سے دوری نے آج انہیں کس مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ میں نے اس خاندان کی آن کی لاج رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی کہ کسی باعزت پیشے سے جڑ جاؤں لیکن سماج نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ کسی نے میری مجبوری کا خیال نہیں کیا۔ خاندان کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے میں نے سب کچھ قربان کر دیا لیکن پھر بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ میں مفلسی اور فاقہ کشی سے تنگ آ چکی ہوں اب میں حالات سے لڑتے لڑتے تھک چکی ہوں۔''

فہمیدہ کی طرح ہمارے معاشرے میں ایسی کتنی ہی فہمیدہ ہوں گی جو خاندانی وقار ڈھانپنے کی کوشش میں کسی دن پیوند خاک ہو جاتی ہیں۔ خاندانی شرافت اور ثروت کے پردے میں چھپی ان بے بس زندگیوں پر سماج کی نظریں نہیں پڑتیں۔
سماج یہ سمجھتا ہے کہ بے روزگاری اور غربت تو صرف سڑک پر بھیک مانگتے فقیروں اور آواز لگا کر ایک ایک دروازہ کھٹکھٹانے والوں کی ہی میراث ہے......

OOOO

اور جام ٹوٹ گیا

گھڑی نے دو بجنے کی اطلاع دی اور میں نے کروٹ بدلتے ہوئے خود سے کہا: ''دو بج گئے اور مجھے ابھی تک نیند نہیں آئی۔''

جب کہ گھر کے ہر کمرے سے خراٹوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور میری آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ کون سے واقعات ہیں جو مجھے بے چین کئے ہوئے ہیں۔ واقعات اتنے سنگین بھی تو نہیں کہ جو میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہے ہیں۔ یہ تو محض میری زندگی سے جڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے وہ واقعات ہیں جن کا تعلق صرف میرے متکبرانہ مزاج سے ہے۔

میں بی اے پاس ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہونے کے باوجود زندگی کی صداقتوں اور حقیقتوں سے دور بھاگتی رہی لیکن ایک ہفتہ میں واقع ہونے والے حادثات نے مجھے وہ سب سکھا دیا جو میں نے اب تک نہ کتابوں سے سیکھا اور نہ ہی والدہ کی تربیت سے صبر و تحمل، انکساری، محبت ان خوبیوں سے میں بالکل ہی ناواقف تھی۔ یہ سمجھ ہی نہ پائی لڑکی کی شادی کے بعد سسرال ہی اس کا اصل گھر ہوتا ہے۔ سسرال کے ماحول میں خود کو ڈھال لینا ہی لڑکی کی زندگی کی اصل معراج ہے۔

میری شادی کے ابتدائی دنوں میں میری والدہ سسرال کے ہر معاملہ میں دلچسپی لیتی

رہی۔ جب بھی سسرال میں کسی فرد کی آمد کی اطلاع ہوتی وہ مجھے اپنے گھر آ کر آرام کرنے کی صلاح دیتیں۔ میری تند مزاجی کی وجہ سے سسرال میں مجھے کوئی نہیں ٹوکتا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہی ہوں۔ ان لوگوں کی نرمی و شرافت کا میں نے خوب فائدہ اٹھایا، میں اپنی نادانیوں کی وجہ سے کامران کے دل اور گھر میں کوئی مقام نہ پا سکی اجنبی سی رہی۔

کامران کا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے لوگ شریف، خوش گفتار، نرم مزاج تھے۔ اپنائیت اور خلوص ان کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ حالانکہ میری ساس ایک بہت بڑے زمیندار کی بیٹی تھیں لیکن انکساری اور اپنے حسن سلوک سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ کامران کے والد کسی فیکٹری میں ملازم تھے۔ وہ ملازمت کے دوران ایک حادثہ میں معذور ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں بچوں کی پرورش کی ذمہ داری میری ساس کے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ اس فرض کو انھوں نے بخوبی نبھایا۔ سلائی کے فن میں مہارت حاصل کر کے انہوں نے اپنے کام کو خوب آگے بڑھایا۔ ماں کو رات دن محنت کرتے دیکھ کامران جلد از جلد کوئی ملازمت کر کے ماں کو راحت دینا چاہتے تھے۔ تینوں بچوں میں سب سے بڑے تھے۔ چنانچہ I.T.I کی سند حاصل کر کے وہ ایک اچھی کمپنی میں میکانک کے طور پر ملازمت کرنے لگے۔

ادھر میرے بی اے کرنے کے بعد امی کو میرے رشتہ کی تلاش تھی اور چاہتی تھیں کہ کسی اچھے خاندان میں بہتر پوسٹ والے لڑکے سے میرا رشتہ ہو جائے۔ بہر حال گریجویٹ ہونے کے بعد تقریباً دو سال تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ رشتے آئے اور لوٹتے رہے۔ انکار کی وجہ تھی میرا سانولا رنگ۔ سچ یہی تو ہے چمک دمک کے اس دور میں تو صرف حسن کا جادو ہی چلتا ہے ایسے میں سانولے رنگ کی کہاں کھپت؟ مناسب رشتہ کے انتظار میں میرے والد بھی تھک گئے۔ ایک دن امی پر خفا ہو گئے۔ کہنے لگے اب اچھے

رشتے کی ضد چھوڑ دو اور رخسار کے لیے جو رشتہ آیا ہے اسے اس کا نصیب سمجھ کر ہاں کر دو۔ لڑکے کی پوسٹ معمولی ہے تو کیا ہوا؟ لوگ تو اچھے ہیں......

والد کے اصرار کرنے پر امی بمشکل راضی ہو گئیں۔ لیکن اپنی انا کی تسلی کے لیے وہ لوگوں سے یہی کہتی رہیں کہ لڑکا انجینئر ہے۔ یہاں تک کہ شادی میں بھی وہ میری ساس سے اپنی فرمائش منواتی رہیں۔ ہر جگہ ان کا ہی سکہ چلتا تھا۔ شادی کے دن بھی موبائل پاس رکھنے کی مجھے سختی سے تاکید کی تھی۔ موبائیل کے اس قدر استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ہر چھوٹی بڑی بات امی تک پہنچاتی رہی۔ موبائل میں دلچسپی بڑھتی دیکھ کر ایک دن میری ساس نے مجھے ٹوکا بھی لیکن میری خفگی دیکھ کر دوبارہ ٹوکنے کی ہمت نہیں کی...... پانی جب سر سے اونچا ہونے لگا تو انہوں نے کہہ دیا: ''اگر تمھیں مائکے میں رہنے سے زیادہ دلچسپی ہے تو پھر وہیں جا کر رہو۔''

بس پھر کیا تھا میرا دل تو مائکے جانے کے بہانے ڈھونڈتا ہی تھا ساس کی زبان سے نکلا ہوا جملہ میرے لیے بہانہ بن گیا۔ میں نے طیش میں کامران سے کہا: ''یہ سب سن کر میں ایک منٹ نہیں رک سکتی۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے نکل کر اپنے مائکے چلی آئی۔ میری آمد پر وہاں سب نے لبیک کہا۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بڑے ناز اٹھائے گئے۔

یہاں پہنچنے کے بعد مجھے مطلق خیال نہ آیا کہ میری ساس کس حال میں ہوں گی اور کامران پر کیا گذر رہی ہو گی۔ میری ساس جو کہ ایک نہایت نرم مزاج اور کشادہ دل خاتون تھیں میرے ایک فون کر دینے سے مجھے یقیناً معاف کر دیتیں لیکن غرور کے سیاہ چشمے سے مجھے سسرال کی اجلی چیزیں بھی سیاہ نظر آ رہی تھیں۔ اس غرور کو تقویت دینے میں میری والدہ معاون ثابت ہوئیں۔ وہ بار بار یہی کہتی رہیں: ''رخسار! تم میری بیٹی ہو۔ اپنی طرف سے جھکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اس طرح آرام سے رہتے ہوئے کئی مہینے بیت گئے۔ مگر اب میں گھر والوں کے مزاج اور برتاؤ میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ باہر والوں اور رشتہ داروں کے طعنے سن سن کر میری والدہ چڑچڑی ہوگئیں۔ اکثر یہ سوال کیا جاتا: "بھئی! کیا بات ہے کافی دنوں سے رخسار کو ہم یہیں دیکھ رہے ہیں سب خیریت تو ہے؟......"

مجھ سے چھوٹی دونوں بہنیں محسنہ اور اختر جن پر میں جان چھڑکتی تھی۔ ان کا ہر کام خوشدلی سے کرتی۔ بچپن میں اپنا کام چھوڑ کر پہلے ان کا ہوم ورک کرواتی۔ ان کے امتحان کے دنوں میں جب تک ان کی مکمل تیاری نہ کروا دیتی مجھے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ بڑی ہونے پر آج وہی دونوں بہنیں آپس میں کہہ رہی تھیں......

"باجی کی وجہ سے ہمارے لیے آئے ہوئے رشتے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ باجی کو ہمارے یہاں رہتے دیکھ کر تمام لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ کسی اچھی جگہ ہمارا رشتہ ہو پائے گا۔ امی نے بھی باجی کو کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے رکھی ہے جس سے باجی ضدی اور مغرور ہوگئی ہیں اسی وجہ سے کامران بھائی کے اصرار کے باوجود سسرال نہیں لوٹتی نہ جانے ان کا یہاں کب تک رہنے کا ارادہ ہے۔ اب کی بار اگر کامران بھائی کے ساتھ وہ سسرال نہیں لوٹیں تو ہم انہیں کسی بہانے اپنی کوشش سے ان کے سسرال بھجوا دیں گے۔ خواہ مخواہ انہیں مائکے پر اتنا ناز ہے۔"

سرگوشی میں کہے گئے بہنوں کے یہ جملے مجھ پر اس قدر گراں گزرے کہ میں بوکھلا گئی اور ان سے لڑنے کے لیے آمادہ ہوگئی مگر دفعتاً مجھے خیال آیا وہ جو کچھ کہہ رہی تھیں غلط بھی تو نہیں...... "رخسار! تم کس کس سے جھگڑو گی؟"

انتقام کی یہ چنگاری بجھاتے بجھاتے کہیں میں بھی نہ بجھ جاؤں...... بچپن میں مجھے دادی جان کی بتائی باتیں یاد آنے لگیں کہ: "غرور اور تکبر کا نشہ پلانے والے ابتدا میں سینکڑوں مل جاتے ہیں لیکن لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دینے، انہیں

سنبھالنے کے لیے ایسے انسان بہت ہی کم ہیں جو زمانے کے نشیب و فراز سے ہمیں آگاہ کریں۔''

حالانکہ ان کی کہی باتیں اس وقت بہت بری لگتی تھیں مگر سچ تو کڑوا ہی ہوتا ہے نا! مگر آج لوگوں میں آئے بدلاؤ نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر میں کسی بارسوخ خاندان سے تعلق رکھتی ہوں تو وہ میرا ماضی ہے۔ میں تو محض ایک معمولی میکنک کی بیوی ہوں جس کی ماں نے اپنی محنت سے اپنے بچوں کی بہترین پرورش کی اور زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ میرے مائکے کا سارا وقار تو میری ماں کے حق میں جاتا ہے۔ جھوٹی شان کے ساتھ جینے والے اللہ کو قطعی پسند نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے کب میری آنکھ لگ گئی پتہ بھی نہیں چلا۔

صبح بیدار ہوئی تو طبیعت کچھ بوجھل سی تھی...... میرا غرور ٹوٹ رہا تھا۔ بکھرے کپڑے سمیٹنے کے بعد میں کامران کا انتظار کرنے لگی لیکن تین بجے تک بھی کامران نہیں آئے۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ دل سے بار بار یہ صدا آنے لگی: ''رخسار! کامران اب تمھیں لینے نہیں آئیں گے۔''

مجھے لگا شاید یہ کوئی روحانی طاقت ہے جو مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سسرال لوٹ جانے کی ترغیب دے رہی ہے۔ میں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ فوراً میرے قدم سسرال یعنی میرے اصلی گھر کی طرف چل پڑے۔ سسرال میں میری شفیق ساس نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ کچھ دیر بعد آ کر وہ میرے پاس بیٹھ گئیں۔ بڑی محبت سے میرے کاندھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کہنے لگیں: ''رخسار بیٹا! اچھا ہوا تم لوٹ آئیں۔ اس روز جب کامران تمہارے گھر سے لوٹا تو بہت بگڑے ہوئے موڈ میں تھا کہنے لگا: ''اگر رخسار کو وہاں رہنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر ہمیشہ کے لیے میں اسے رخصت دے دوں گا۔'' یہ سن کر میں بہت گھبرا گئی۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

اللہ کے آگے گڑگڑا کر دعا کی۔ خدا ایسا کچھ کرے کہ میری بہو خود بخود میرے بیٹے کی زندگی میں واپس آ جائے۔ دیکھو اللہ نے میری سچے دل سے مانگی دعا قبول کر لی اور تم لوٹ آئیں۔ اب تمھیں اس گھر کو سنبھالنا ہے۔ ہم تو شاخ پر ٹکے زرد پتے ہیں کبھی بھی گر سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کی باتیں سن کر میں بھی آبدیدہ ہو گئی......

میں نے آہستہ سے کہا: ''امی! مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے ہی آپ لوگوں کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ کامران کا ناراض ہونا واجبی تھا۔ پچھلے ہفتہ انہوں نے ساتھ چلنے کے لیے بہت اصرار کیا تھا۔ میں نے اپنی ضد کی وجہ سے ان کی بات نہیں مانی مگر اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔''

میری ساس میرے اندر آئے بدلاؤ کو دیکھ بہت خوش اور مطمئن ہو گئیں۔ انہوں نے کہا: ''بیٹا مجھے تم سے یہی امید تھی اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئیں......''

دوسری صبح جب کامران ناشتہ کے لیے اپنی امی کو جگانے گئے تو کئی بار آواز دینے کے بعد بھی وہ بیدار نہیں ہوئیں۔ میں بھی کامران کی آواز سن کر باورچی خانے سے دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچی۔ میں نے دیکھا ایک عجیب سا اطمینان میری ساس کے چہرے پر رقصاں ہے۔ کتنی آسانی سے دنیا کی کثافتوں سے آزاد وہ ابدی نیند سو رہی تھیں......واقعی وہ بہت عظیم خاتون تھیں۔ تبھی تو ان کی عظمت نے مجھے بدنامی کے داغ سے بچا لیا۔ ان کی دعاؤں کی تاثیر کے سبب ہی میں آج کامران کے پاس لوٹ آئی۔ اگر میں ایک دو دن بھی رک جاتی تو میری ساس کا انتقال ہو جاتا۔ پھر زمانہ مجھے یہی الزام دیتا کس قدر سخت دل تھی اور میں بھی خود کو معاف نہیں کر پاتی کہ میری وجہ سے میری شفیق ساس اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور کامران کی نظروں سے گرتی سو

الگ……

اب گھر کی تمام ذمہ داری میری تھی۔ ہر کوئی مجھے اس گھر کو سنبھالنے کی تاکید کر رہا ہے۔ گھر…… میری ملکیت! یہ چھوٹا سا گھروندہ ہی سہی لیکن ہے تو میرا اصلی گھر۔ اس گھر سے جڑی ہر بات، ہر راحت، اتار چڑھاؤ میری ذات سے جڑے ہوئے ہیں۔

OOOO

بوجھ

میرے شوہر کاشف بہت بڑے ادیب تو نہیں تھے لیکن انھیں لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی تھی گھر میں آنے جانے والے متواتر کاشف کے تحریر کردہ افسانوں کو کتابی شکل دینے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ کاشف کا ذہن بھی کتاب شائع کروانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حالانکہ کاشف پرائمری اسکول کے ٹیچر تھے لیکن فراخ دلی اور بے دریغ روپیہ خرچ کرنا ان کی کمزوری تھی۔ اس لیے اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ میں انھیں ایک ہفتے سے کچھ زیادہ پریشان دیکھ رہی تھی۔ لوگوں نے کتاب چھپوانے کا مشورہ تو دیا لیکن اس کے انتظامات کا کوئی طریقہ نہیں بتایا۔

کتاب چھپوانے کے لیے کاشف کی پریشانی اور بے قراری مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے ایک دن مناسب موقعہ دیکھ کر کاشف سے کہا: ''انشا اللہ اب آپ کی خواہش ضروری پوری ہوگی۔ کتاب شائع ہو کر رہے گی۔''

انھوں نے دریافت کیا: ''وہ بھلا کیسے؟ جبکہ میرے جیب میں فی الحال سو روپئے بھی نہیں ہے۔''

''اس کا انتظام ہو گیا ہے آپ فکر نہ کریں۔''

پھر میں نے کاشف کو سمجھاتے ہوئے کہا: ''جو دو روز پہلے میں پڑوسن کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی وہاں میں اپنا بھی کچھ کام لے گئی تھی۔ میں نے اس دن سونے کا اچھا بھاؤ دیکھا۔ میرا منگل سوتر ٹوٹ گیا تھا جب میں نے اسے بنانے کے لیے سنار کو دیا اس نے اسے دیکھ کر کہا دیدی یہ نہیں بن سکتا۔ میں نے اسے بیچنا ہی بہتر سمجھا اور اسے بیچ دیا۔ بس آپ سلامت رہیں۔ اس طرح کے کئی منگل سوتر بن جائیں گے۔ اب آپ اس رقم سے یقیناً کتاب چھپوا سکتے ہیں۔''

چونکہ زیور کی اچھی قیمت آئی تھی اس لیے کاشف نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا اور فوراً اپنے افسانوں کو کتابی شکل دینے میں مصروف ہو گئے۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انھیں قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔

کتاب میں اظہار تشکر میں میرا نام دکھاتے ہوئے کہا: ''دیکھنا فریدہ یہ کتاب ادبی حلقے میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ اس کی بہت پذیرائی ہوگی۔ تم جانتی ہو ان افسانوں کو لکھتے وقت مجھے کس کرب سے گزرنا پڑا ہے۔''

میں نے کہا: ''یقیناً آپ نے سماج اور اس دور کی سچائی اس میں سمودی ہے۔ اس کتاب کی ہر کہانی پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے اطراف سے اٹھا ہوا واقعہ ہے۔''

کتاب شائع ہونے کے بعد کاشف ابتدا میں اپنے دوستوں کو بطور تحفہ اس کتاب کو دیتے رہے۔ ابتدا میں ان کی کچھ کتابیں اسی طرح تقسیم ہوتی رہیں۔ پھر انھوں نے تھوڑی جرأت کر کے کچھ لوگوں کے ہاتھوں کتاب تھماتے ہوئے اس کی قیمت کا بھی ذکر کرنا شروع کیا۔ کچھ لوگ ٹال مٹول کرتے کچھ بہانہ کر کے کتاب کو بعد میں لیجانے کا وعدہ کرتے اور کچھ افراد کتاب کہاں کہاں فروخت ہو سکتی ہے اس کی نشاندہی کر دیتے۔ اس طرح کتاب شائع ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے لیکن کوئی خاص نتائج سامنے نہیں آئے۔ ایک دن کاشف کے دوست کے ساتھ ایک پروفیسر گھر تشریف

لائے۔کاشف نے انھیں اپنی کتاب دی پھران سے کتاب کے شائع ہونے کی پوری روداد سنائی۔انھوں نے لوٹتے وقت کاشف اوران کے دوست کو اپنے شہر آنے کے لیے مدعو کیا اور یہ بھی کہا کہ ہمارا بڑا شہر ہے یہاں آپ کی کتاب کے فروخت ہونے کے امکانات کافی ہیں اور کچھ دنوں بعد ہمارے شہر میں سیمینار بھی ہونے والا ہے۔ اس سیمینار میں آپ ضرور شرکت کریں۔ میں کچھ لوگوں سے آپ کوملوادونگا۔ یہ سن کر کاشف بہت خوش ہوئے۔اب انھیں سیمینار کے دن کا بے صبری سے انتظار تھا۔فوراً اپنے دوست کے ساتھ بمبئی روانہ ہوگئے۔ جاتے وقت سوٹ کیس میں کپڑوں سے زیادہ کتابیں رکھ رہے تھے۔میں نے سوٹ کیس کے بڑھتے ہوئے وزن کو دیکھ کر کہا:

''بس بھی کرو۔وزن کافی بڑھ چکا ہے۔کیا اتنا بوجھ سوٹ کیس اٹھا سکے گا؟''

یہ سن کر کاشف نے مجھ سے کہا:''فریدہ تمھیں معلوم ہے پروفیسر صاحب نے مجھ سے کہا ہے ہمارے شہر میں آپ کی کتابیں فروخت ہوجائیں گی۔ہوسکتا ہے یہ سچ ثابت ہواسی امید پر اتنی زیادہ کتابیں رکھ رہا ہوں۔دیکھئے اب وہاں جا کر کیا ہوتا ہے۔''

بمبئی میں پروفیسر صاحب نے بڑے تپاک سے کاشف اوران کے دوست کا خیر مقدم کیا۔دوسرے دن ان کو اپنے ساتھ سیمینار ہال لے گئے۔شہر کے امراء اور ادیبوں سے ملوایا۔ایک صاحب جو سیمینار میں مہمان خصوصی بن کر آئے تھے۔اسٹیج پر تشریف فرماتھے۔وہ ایک سیاسی رہنما تھے۔انھوں نے اس سیمینار کے انتظامات کے لیے ایک موٹی رقم بطور donation دی تھی تا کہ سیمینار کے بینر پران کا نام چمکے۔وہ اردو بہت کم جانتے تھےلیکن اردو اشعار غلط تلفظ کے ساتھ پڑھنے کا انھیں خبط تھا۔جب وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو اردو کی کسمپرسی پر اپنے احساسات بیان کئے۔ان کی تقریر سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس زبان کی ترقی کے لیے وہ کتنے کوشاں ہیں اور اس شہر میں گویا اردو کے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں۔تقریر ختم کرتے ہوئے آخر میں

انھوں نے کہا اس زبان کی ترقی کے لیے میں آپ سب کے ساتھ ہوں۔ مجھ سے آپ جس طرح کی جو بھی مدد لینی چاہیں لے سکتے ہیں۔ میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ ان کے اس جملے کو سن کر سب نے زوردار تالیاں بجائیں۔ ادیبوں کو حوصلہ ملا۔

پروفیسر صاحب بہت خوش ہوئے۔ کاشف کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا: ''اب آپ کا کام ہو گیا۔ یہ سمجھو آپ کی کافی کتابیں فروخت ہو جائیں گی۔ ابھی جو صاحب تقریر کر رہے تھے وہ میرے دوستوں میں سے ہیں۔ ممکن ہے اس کتاب کی کئی کاپیاں خرید لیں۔ ہم کل ہی ان کے گھر چلتے ہیں۔''

دوسرے دن کاشف، ان کے دوست اور پروفیسر صاحب ان کے گھر پہنچے۔ کافی دیر بیل بجانے کے بعد ایک ملازم باہر آیا اور کہا کہ صاحب ابھی نہا رہے ہیں اور سب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد تقریباً چار پانچ سالہ بچہ ہاتھ میں حساب کتاب کا ایک کاغذ لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں آیا۔ کاشف کے ہاتھ میں کاغذ دے کر اسے پڑھنے کی ضد کرنے لگا۔ کاشف نہ چاہتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ کسی کی تحریر پڑھنا خلاف اصول ہے لیکن پھر بھی بچے کے بار بار کہنے پر اس کاغذ پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ یہ کاغذ دراصل مہینے کے اخراجات کا گوشوارہ تھا۔ ملازموں کی تنخواہیں ۱۰ ہزار روپے بیوٹی پارلر کا بل چار ہزار روپے، بچہ کا جیب خرچ پانچ ہزار۔ اس طرح کے اخراجات کی ایک طویل فہرست تھی جس کا کل تخمینہ پچاس ہزار روپے تھا۔ کچھ دیر بعد وہ صاحب نہا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ آتے ہی عجلت دکھاتے ہوئے کہا:

''میں ذرا جلدی میں ہوں مجھے ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنا ہے۔''

پروفیسر صاحب نے کاشف اور ان کے دوست کا تعارف کرواتے ہوئے کہا: ''ان صاحب کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے، بہت عمدہ کتاب ہے مجھے امید ہے کہ آپ اس

کی چند کاپیاں ضرور رکھ لینگے۔ اس طرح ان کی کچھ مدد بھی ہو جائے گی۔''
پھر کاشف نے انھیں کتاب پیش کی وہ کچھ دیر تک کتاب کو الٹ پلٹ کرتے رہے۔ بعد میں پروفیسر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: ''آپ تو جانتے ہیں میرے تینوں بچے انگریزی میڈیم سے پڑھ رہے ہیں۔ وہ اردو کچھ بھی نہیں جانتے۔ رہا میرا سوال مجھے بھی اتنی خاص اردو نہیں آتی اور پھر مجھے پڑھنے پڑھانے کی فرصت کہاں؟ آپ کہہ رہے ہیں تو مدد کے طور پر اپنی لائبریری کے لیے ایک کاپی رکھ لیتا ہوں تاکہ اردو کا قرض ادا ہو۔ مجھے اردو زبان سے ہمدردی ہے۔'' پھر اپنی جیب سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر اس طرح دینے لگے جیسے کسی کو خیرات دے رہے ہوں۔
کاشف بہت دولت مند نہیں تھے لیکن غیرت منداور خوددار تھے انھوں نے نوٹ واپس ان کے جیب میں یہ کہتے ہوئے ڈال دیا کہ: ''آپ پروفیسر صاحب کے دوست ہیں اس طرح ہمارے بھی دوست ہوئے۔ یہ کتاب میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لیجیے۔''
پھر کاشف نے کہا: ''دراصل اردو زبان کے متعلق کل آپ کی تقریر سنی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا۔'' اس طرح پروفیسر صاحب اور کاشف وہاں سے لوٹ آئے۔
کاشف نے اس واقعہ کے بعد اندازہ کرلیا کہ یہ محض پروفیسر صاحب کا ایک وہم اور خیال خام ہے اور کچھ نہیں جتنا بڑا شہر اتنے ہی یہاں کے لوگوں کے جدا جدا فضول اخراجات۔ حاجتیں جنھیں وہ ضروری سمجھ بیٹھے ہیں اور پھر یہاں کے لوگوں کو اس کتاب کو پڑھنے کی فرصت بھی کہاں! وہ تو اس زبان کی طرف دوڑ رہے ہیں جو انھیں مالا مال کردے گی۔ کاشف نے سوچا سمجھداری اسی میں ہے کہ کتابوں سے بھرے ہوئے اس سوٹ کیس کو اٹھا کر اپنے شہر روانہ ہو جاؤں۔
ابھی رات کے دس بج رہے تھے۔ دونوں بچے سو چکے تھے۔ کاشف بغیر فون کئے بنا بیل بجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور بیٹھ کر اس دن کا اخبار پڑھنے لگے۔ میں

نے انھیں دیکھتے ہوئے کہا: ''آپ کب آئے پتہ ہی نہیں چلا۔ کیسا رہا آپ کا سفر اور ہاں کیا ہوا آپ کی کتابوں کا؟ کچھ کام بنا یا نہیں؟''

کاشف کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر سرد آہ بھرتے ہوئے کہنے لگے: ''نہیں کچھ نہیں ہوا۔'' پھر انھوں نے اس شہر اور وہاں کے لوگوں کی تمام روداد سنائی۔

یہ روداد سن کر میں نے محسوس کیا کہ گھر میں کتابوں کا بوجھ اور کاشف کے دل میں میرا منگل سوتر بک جانے کا بوجھ ہے۔ میں نے کاشف کا موڈ بدلنے کے لیے مذاق کے طور پر کہا: ''بہتر ہوتا آپ کتابوں کے اس بوجھ کے بجائے سنتروں سے بھری کچھ ٹوکریاں ساتھ رکھ لیتے تو لوگ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔''

OOOO
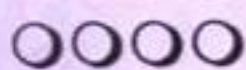
انتظار

سیاہ رات کی خاموشی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری بس اس خاموشی کو چیرتی ہوئی اس تالاب کے کنارے سے گزر رہی تھی جس کے چاروں طرف غریب اور مفلس لوگ پھٹے چیتھڑوں اور لحافوں میں اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے دنیا و مافیھا سے بے خبر بیٹھے ہوئے اور کچھ سوئے ہوئے تھے۔اماں بس کی کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئیں ان فقیروں اور تالاب کی اٹھتی ہوئیں لہروں پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھیں۔وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آرہی تھیں۔ میں کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کئے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ ہوسکتا ہے ہوا کے جھونکوں سے اماں پر نیند کا غلبہ طاری ہوگیا ہو۔جب کافی دیر تک اماں کچھ نہیں بولیں تو میں نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:"اماں کہیں آپ سوتو نہیں گئیں؟اچانک آپ اتنی خاموش کیوں ہوگئیں؟ کن خیالوں میں کھوگئیں؟"

اماں نے آہستہ سے کہا:"نہیں بیٹا تم جانتی ہو مجھے کئی دنوں سے اتنی آسانی سے نیند نہیں آرہی ہے وہ تو میں یونہی اس تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے لوگوں میں اپنے پرویز کو ڈھونڈ رہی تھی۔"

"اماں آپ بھی کیا فضول سوچتی ہیں۔وہ بھلا اس تالاب کے کنارے اور ان فقیروں کے درمیان کیونکر ہوسکتے ہیں؟"

''نہیں بیٹا ایسا مت کہہ۔ میرا بچہ ضرور کہیں نہ کہیں ہوگا۔'' یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

میں دل میں سوچنے لگی: ''یا اللہ یہ کیسی دیوانگی ہے؟ کیسی محبت ہے اور کس طرح کی ممتا ہے جو ہر پل ہر لمحہ بیٹے کی محبت سے جڑی ہوئی ہے۔ اماں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے بیٹے کو بھلا نہیں پائی۔ انھیں زمین کے چپے چپے میں بس ان کا بیٹا پرویز ہی نظر آتا ہے۔'' میں تو کچھ دیر کے لیے اماں کی دیوانگی دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ ایسے وقت نہ جانے کیوں تمام ہمت یکجا رکھنے کے باوجود بھی انسان کو منفی خیالات ستانے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ میرے اللہ وہ جہاں بھی ہوں ان کی حفاظت کرنا۔ اماں کی یہ کیفیت کہیں اماں کو پاگل نہ کردے۔ یا اللہ انھیں حفاظت میں رکھنا۔ یہ دعا دل سے نکل رہی تھی کہ اچانک میں ماضی کے دریچے میں جھانکنے لگی۔

آج کی طرح وہ دن بھی اتوار ہی کا دن تھا۔ آج سے تقریباً پانچ سال پہلے پرویز گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ رات کا وقت تھا اور اس وقت یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ پرویز واپس آئینگے یا نہیں۔ اماں کتنے ارمانوں سے مجھے بہو بنا کر اس گھر میں لائی تھیں۔ اس وقت یہ کسے معلوم تھا کہ پرویز کبھی ملازمت کے لیے جستجو کریں گے ہی نہیں۔ اماں تو یہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد جب اخراجات بڑھیں گے تو پرویز یقیناً کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور تلاش کرلیں گے۔ پھر اس گھر کا ماحول درست ہوجائے گا۔

دراصل میرے غریب والدین ایسے باوقار خاندان سے آئے رشتے کو ٹھکرانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بھی یہی امید کئے ہوئے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ ضرور ایک نہ ایک دن پرویز میں تبدیلی آئے گی۔ وہ تعلیم یافتہ ہے کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت ضرور کریں گے۔ اسی انتظار میں ہماری شادی کو دو سال ہوگئے لیکن پرویز نے ملازمت کے لیے کہیں ہامی نہیں بھری۔ اس کے برعکس دوستوں کے ساتھ ان کی آوارگی میں

اضافہ ہوا۔ میری ساس اور خسر کے تعلقات یوں کشیدہ تھے کہ خسر سارا الزام اماں پر لگاتے تھے۔ ہمیشہ یہی کہتے کہ تمہارے ہی لاڈ پیار نے بچوں کو بگاڑا ہے۔ ورنہ انھیں جینے کا سلیقہ آجاتا۔

خسر صاحب ایک آفس میں کلرک تھے۔ پوری ملازمت میں کبھی کسی سے ایک روپیہ کی بھی رشوت نہیں لی۔ وہ ہر ایک کا کام دل و جان سے کرتے تھے وہ دیکھتے اور محسوس کرتے ان کے آفس کے رشوت خور کلرکوں کے اور چپراسیوں کے بچے کس طرح محنت و لگن سے پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں اور ان کے والدین سر اٹھا کر خوشی خوشی اپنی اولاد کے کارناموں کو بیان کرتے ہیں۔ یہ سب سن کر میرے خسر کی بھی یہی خواہش ہوتی کاش میرا بیٹا بھی کچھ بن جاتا لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ وہ حسرت سے آفس کے تمام لوگوں کی باتیں اماں کو سناتے۔ اماں دل ہی دل میں اپنے بیٹے کے لیے دعا کرتی۔

پرویز میرے خسر کی تمام باتیں سن کر بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو سدھارتے، ان میں کوئی تبدیلی ہوتی وہ چڑچڑے سے ہوگئے۔ ان کو لگتا ان کے والدین ہمیشہ ایک ہی بات کرتے ہیں۔ ان کے مزاج میں تبدیلی آتی گئی۔ وہ باغی ہوگئے۔ اب والدین کی باتوں کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ وہی کرتے جو ان کو کرنا ہوتا۔

وہ کیسا بھیانک دن تھا۔ رات کے تقریباً نو بج رہے تھے۔ اظہر جھولے میں کلکاریاں مار رہا تھا۔ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ دستر خوان پر کھانا رکھ دیا گیا تھا۔ میرے خسر صاحب پرویز سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ”کیا ہوا ملازمت کا تم تو اس ہفتے فلاں کمپنی میں ملازمت اختیار کرنے والے تھے نا؟“

اماں نے پلیٹ میں بس سالن نکالا ہی تھا کہ پرویز نے گرج دار آواز میں میرے خسر کو جواب دیا۔ پرویز کے یہ تیور، یہ لہجہ خسر صاحب برداشت نہ کر سکے۔ سیدھا کہہ دیا:

''بیٹا اونچی آواز میں بات کرنا ہوتو کہیں اور جا کر رہو۔ یہ سب میں برداشت نہیں کرسکتا۔''

ابھی تک گھر کے کسی فرد نے بھی ایک لقمہ نہیں اٹھایا تھا۔ اپنی اپنی جگہ سب سہمے ہوئے تھے۔ پڑوسیوں کے خوف سے سب خاموش تھے۔ پرویز نے طیش میں پلیٹ آگے کھسکایا اور فوراً یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل پڑے: ''قسم کھا کر کہتا ہوں اب دوبارہ اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔''

اس وقت یہ کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ واقعی وہ یہ سچ کر دکھائیں گے۔ پرویز اس دن رات بھر گھر نہیں آئے۔ میں نے ساری رات بے چینی میں گذاری۔ میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دیتی رہی کہ وہ کسی دوست کے یہاں رہ رہے ہوں گے۔ شاید ایک دو دن میں لوٹ آئیں۔ جب پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ پرویز کی کوئی خبر نہیں ملی تو ان کی یہ گم شدگی گھر کے تمام افراد اور خود میرے لیے تشویش کا سبب بن گئی۔ ہر کوئی اپنے اپنے طور پر انھیں تلاش کرنے لگا۔ اطراف کے قصبوں میں رہنے والے تمام رشتے داروں کے یہاں انھیں دیکھ آئے کہیں سراغ نہ ملا۔ محلے کے لوگوں اور رشتہ داروں میں جب یہ خبر پہنچی تو لوگ اماں سے ملنے گھر آتے اور اپنے اپنے طور پر ان کی دلجوئی کرتے۔ اماں بیٹے کی ایک ایک بات یاد کر کے رونے لگتیں۔ اس وقت میں مضبوط چٹان کی طرح یہ سب کچھ دیکھتی رہی خاموشی سے سنتی رہی لیکن زبان سے اف تک نہیں کیا۔ ہر بار کی طرح اسے اپنی قسمت اور اللہ کی مرضی سمجھ کر سب کچھ اس کی ذات کے حوالے کر دیا۔ اپنے آپ کو نماز اور تلاوت میں مصروف کر دیا۔ لیکن جب بھی اظہر کے چہرے پر اس کی عادتوں میں پرویز کی شباہت دیکھتی، اس وقت ان کی یاد میرے صبر کو توڑ دیتی۔ مجھے بے قابو کر دیتی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے۔ میں نے اس حادثہ کا ذمہ دار اپنے خسر کو نہیں ٹھہرایا کیونکہ میں نے ان کی آنکھوں میں اپنی اولاد کے لیے

سپنے سجے دیکھے تھے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے جو کچھ کہہ رہے تھے پرویز کی بہتری کے لئے۔ مجھے پہلے ہی دن سے گھر کے تمام لوگوں نے عزت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ ساس اور خسر دونوں مجھے بہت چاہتے۔ میں ان کی چاہت کو ٹھکرا کر میکے میں کیسے رہ سکتی۔ میرا ضمیر اس بات کے لیے راضی نہیں تھا۔ میرے خسر کو کیا معلوم تھا کہ ان کا کہا ہوا ایک جملہ عظیم حادثہ بن جائے گا۔ وہ خود اس واقعہ کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کا کتنا ہی بڑا حادثہ کیوں نہ ہو وقت آہستہ آہستہ ان زخموں پر مرہم رکھ دیتا ہے۔ وقت میں بڑی طاقت ہے۔ اس کے بہاؤ میں انسان غموں کو بھلانے لگتا ہے۔ لیکن یہ گمشدگی کیا ہے جس کے باعث کئی طرح کے خیالات آنے لگتے ہیں۔ ہر دن ہر لمحہ یہی لگتا ہے جیسے گم شدہ انسان ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور ہم اس سے مخاطب ہیں۔ یہ کیسی عجیب کیفیت ہے۔ کیسی دیوانگی ہے۔ انسان تلاش کرتے کرتے جب تھک جاتا ہے تو اسے سمندر اور تالاب کے کناروں ندیوں، میدانوں میں ہر جگہ وہی پرچھائیں، وہی سایہ نظر آتا ہے ہر آواز میں وہی آواز۔ جب وہ آگے بڑھ کر اس سائے سے ٹکرانا چاہتا ہے اس وقت اسے احساس ہوتا ہے یہ صرف اس کا وہم تھا اور کچھ نہیں۔

انتقال ہوئے انسان کو دوگز زمین میں دفن کر کے اسے خدا کے حوالے کر دیتے ہیں اس وقت خدا ہی ہمیں صبر دیتا ہے۔ لیکن گم شدہ انسان کے لیے یہی آواز نکلتی ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہوگا، کیسی حالت میں ہوگا اور یہ یاد آتے ہی کھانا بھی زہر لگنے لگتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب گم شدہ انسان کا پسندیدہ کھانا تیار ہو۔ ہر لقمہ ایسا لگتا ہے جیسے ہم خواہش سے نہیں بلکہ بھوک مٹانے کے لیے کھا رہے ہوں۔ جب جوان بچے ایسا قدم اٹھاتے ہیں ان کے والدین تو بےچارے جیتے جی مر جاتے ہیں۔ تمام زندگی

انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں پتھرا جاتیں ہیں۔ وہ زندگی کی رونقوں سے بے نیاز ہو کر غمزدہ وافسردہ زندگی جینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہفتہ کا وہ دن مہینے کی وہ تاریخ یاد کر کے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ مچل مچل کر یہی کہتے ہیں کس طرح ہم اپنے بے چین دل کو تسلی دیں اور کتنا انتظار کریں۔

OOOO

وہ نہیں میں

یہ اسکول شہر کی مشہور و معروف اسکولوں میں سے ایک ہے۔ حالانکہ اس کو قائم ہوئے
کئی برس ہو چکے ہیں لیکن آج بھی اس اسکول نے ہر اعتبار سے اپنا وقار قائم رکھا ہے
یہی وجہ ہے کہ ہر صاحب حیثیت اس اسکول میں اپنے بچوں کا داخلہ کروانا چاہتا ہے۔
میں بھی کامران کے داخلہ کے لیے یہی خواہش رکھتی تھی لیکن عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے
میرے دل میں وسوسہ تھا کہ پتہ نہیں اس بناء پر مسترد کر دیا جائے۔ اسکول کا چپراسی
باری باری ہر بچہ کو اس کے والدین کے ساتھ بلا رہا تھا۔ والدین کے چہرے مضطرب
تھے۔ کمرے سے نکل کر ہر آنے والے سے یہی پوچھتے کون سے سوال پوچھے۔ کچھ
ایسی ہی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ آخر کچھ دیر بعد ہماری باری آ ہی گئی۔ کامران سے
اساتذہ نے مختلف سوالات کئے۔ کچھ نے چارٹس دکھا کر مختلف تصاویر کے نام پوچھے۔
کامران نے بیشتر سوالوں کے صحیح جواب دیئے۔ اب والدین کے انٹرویو کی باری تھی۔
مجھ سے پہلا سوال پوچھا: ”کیا آپ ملازمت کرتی ہیں؟“

”ہاں میں لیکچرر ہوں۔“

”اور ان کے والد کیا کرتے ہیں؟“

میں خاموش رہی۔ میری خاموشی کو دیکھتے ہوئے ایک ٹیچر نے افسوس کا اظہار کرتے

ہوئے کہا: ''معاف کرنا کیا ان کا انتقال ہو گیا؟''

انتقال لفظ نے مجھے جھنجھوڑا اور میں نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے کہا: ''نہیں......''

میری کیفیت کو دیکھتے ہوئے اساتذہ نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے چپراسی سے دوسرے بچے کو بلوانے کو کہا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے آ کر کسی طرح بینچ پر بیٹھ گئی۔ کیونکہ انٹرویو ختم ہونے کے صرف ایک گھنٹے کے بعد بچوں کے انتخاب کی فہرست لگنے والی تھی اس لیے گھر جا کر دوبارہ واپس آنا مناسب نہیں سمجھا۔

اچانک گیٹ کے سامنے ایک کار رکی۔ میری ہم عمر ایک خوبصورت سی عورت بچے کا ہاتھ تھامے کار سے اتری۔ اسی کے ساتھ بیٹھے فہیم بھی نیچے اترے۔ گھڑی دیکھتے ہوئے کہا: ''چلو عرشی ہم کہیں لیٹ تو نہیں ہوئے۔ دانش کا نمبر آتا ہی ہوگا۔''

پھر وہ تینوں اسی جگہ چل دیئے جہاں والدین اپنے بچوں کو ساتھ لیے بیٹھے تھے۔ میرا دل اس بات کا کامل یقین کر چکا تھا کہ فہیم نے قطعاً مجھے نہیں دیکھا۔ میں خاموش بیٹھی خلاؤں کو گھورتی ہوئی ماضی میں کھوگئی۔ میرے غرور اور فہیم سے انتہا نفرت رکھنے کے باعث میں نے یہ جاننا بھی نہیں چاہا کہ فہیم کی زندگی کس حال میں گذر رہی ہے۔ ان کا اس شہر میں کب ٹرانسفر ہوا۔ دوسری شادی اور یہ خوبصورت بچہ! ان پانچ چھ سالوں میں ان کی زندگی کتنے مرحلے طے کر چکی ہے۔ میں نے طلاق لیتے وقت یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ مردوں کی زندگی کے باغ جس قدر جلد اجڑتے ہیں دوبارہ اتنے ہی جلد سنور بھی جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس عورتوں کی زندگی سے بہاریں جتنی جلدی رخصت ہوتی ہیں دوبارہ بہت آہستگی سے وہاں آ کر اپنا خیمہ تانتی ہے۔ کتنے پُر مسرت اور خوشگوار تھے وہ دن جب میں ۲۲ سال کی تھی۔ میری خوش قامتی اور حسن کو دیکھتے ہوئے میرے گریجویٹ ہوتے ہی کئی رشتے آنے لگے۔ آخر فہیم کی ملازمت اور خاندان کو دیکھتے ہوئے اس رشتہ کو منظور کیا۔ میں اپنے والدین کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی

تھی۔ میری شادی میں والدین اور رشتہ داروں نے ہر قسم کے ارمان نکالے۔
ہمارے گھر میں والدین اور میرے علاوہ میری ایک بیوہ چچی تھی ان کا تعلق بہت غریب گھرانے سے تھا۔اس کے برعکس میری والدہ ایک رئیس گھرانے سے تھیں۔ چچی بہت محنتی تھیں۔ وہ گھر کے بیشتر کام خود انجام دیتیں۔ میں اپنی پڑھائی، کمپیوٹر، ٹی وی اور سہیلیوں میں مصروف رہتی اور والدہ اپنی لیکچررشپ میں۔خاندان کے اکثر لوگ میرے والدین کے دست نگر تھے اس لیے اکثر لوگ امی کے اشاروں پر حکم بجا لاتے۔ میں نے اور میری والدہ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ سسرال اور میکے میں بہت فرق ہوتا ہے۔لڑکیاں اپنے حسنِ سلوک اور خدمت سے سب کے دل پر راج کرتی ہیں۔ میری والدہ کی طرح سسرال والے ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتے۔ابتداء میں مجھے بھی سسرال میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن کچھ مہینوں بعد سسرال والے چاہتے تھے کہ میں اس سیر سپاٹے کی زندگی سے الگ ہٹ کر خانہ داری میں دلچسپی لوں۔ شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ میں نے میکے میں کبھی کچھ کام کیا ہی نہیں۔ آہستہ آہستہ فہیم اپنی والدہ کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے ٹوکتے۔ بجائے اس کے کہ میں اپنی غلطی تسلیم کرتی، بحث کرتی، منہ درازی کرتی۔ فہیم کے پر وقار والدین اس طرح کے ماحول سے عاجز آگئے۔ جب میں ان جھگڑوں کا اپنی والدہ سے ذکر کرتی وہ مجھے بجائے ڈانٹنے اور سمجھانے کے یک طرفہ بات کرتے ہوئے مجھے میکے میں آنے کی صلاح دیتیں۔ میرے والد جو امی کے مزاج کے آگے اف نہیں کر سکتے تھے خاموش تماشائی بن کر سب کچھ دیکھتے رہے۔ آخر میں کئی کئی دن میکے ہی میں رہنے لگی۔ پھر امی مجھے تسلی دیتی ہم طلاق دلوا کر تمہاری دوسری شادی کروا دیں گے۔ وہ موجودہ ماحول سے بے خبر تھی کہ آج شادی شدہ بچہ والے مرد بھی کنواری لڑکیوں کی چاہت میں رہتے ہیں۔
آخر کار ایک دن امی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اور فہیم کے گھر والوں کے اصرار پر فہیم

نے مجھے طلاق دے دی۔ فہیم نے مجھے ہمیشہ دل سے چاہا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ دن جب طلاق دی گئی میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ جب وکیل کے ساتھ فہیم میرے کمرے میں دستخط لینے آئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں لیکن میرے غرور اور میری انانیت نے مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ ہی نہیں دیا کہ یہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔ کاش کہ اس وقت میں یہ سمجھ لیتی کہ شاید اسی لیے اسلام نے طلاق کو بدترین فعل قرار دیا ہے...... میرے طلاق لینے کے بعد امی کی کوشش سے بے جوڑ رشتے آتے رہے۔ آخر میں نے دوسری شادی کا خیال ترک کر کے پڑھائی کو آگے بڑھایا اور لیکچرر بن گئی۔

جب وہ تینوں انٹرویو دے کر لوٹے تو کامران، دانش کے ساتھ جا کر ایسے ملا جیسے سگے بھائی اور پرانے دوست ملتے ہیں۔ میں نے کچھ زور سے کہا: ''کامران ادھر آؤ......''

فہیم جانی پہچانی آواز سن کر پلٹے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے۔ پھر عرشی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''میں دانش کو ساتھ لیے جاتا ہوں۔ دیکھوں تو یہ ڈرائیور کہاں چلا گیا۔''

میں عرشی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی: ''کیا آپ شروع سے یہیں رہتی ہیں......''

''نہیں ابھی ان کا ایک سال پہلے ٹرانسفر ہوا ہے۔'' پھر وہ خود ہی کہنے لگی: ان کے آنے کے بعد ابھی بھی وہاں کے لوگ اور بالخصوص آفس والے ان کی بہت یاد کرتے ہیں۔ آنے والے دن اسٹاف کے سیکریٹری سے لے کر ہر کوئی اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا۔ دیکھیے نا دانش کے متعلق ٹیچرس نے کہہ دیا کہ یہ بچوں کی عمر کے مطابق فٹ نہیں ہوتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی طرح ٹیچرس کو راضی کر لینگے۔ ان کا نیچر ہی کچھ ایسا ہے۔ اسی طرح ان کی امی بھی بہت خوش مزاج ہیں۔ مجھے زیادہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر ٹوکتی ہیں۔ آرام کرنے کے لیے کہتی ہیں۔ میں بہت خوش نصیب ہوں جو اتنے اچھے شوہر اور سسرال والے ملے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دانش بھی اپنے

والد کی طرح ویسا ہی بڑا آدمی بنے۔''
وہ شاید میرے صحت مند ہونے کے باعث یا کبھی فہیم نے پرانا البم عرشی کو دکھانا مناسب نہیں سمجھا ہوگا وہ مجھے پہچان نہ سکی۔ اپنے اور فہیم کے متعلق فراخدلی اور صاف دلی سے کہے جارہی تھی...... میں نے محسوس کیا میں اور میرے امی کس قدر غلط تھے۔ فہیم اور ان کے گھر والوں کی قدر ہی نہیں جانی۔ وہ باتیں جو عرشی کے فراخدلی کے باعث فہیم کی خوبیاں ہیں میں نے اپنی تنگ دلی سے شک کی بناء پر خامیاں سمجھیں۔ میں ان کو لڑکیوں سے بات کرنے پر ٹوکا کرتی تھی ان پر شک کرتی تھی۔ واقعی زندگی ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کا ایک دوسرے کو سمجھنے کا نام ہے ورنہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اگر درگزر نہ کریں تو شاید کتنی عورتیں میری طرح طلاق شدہ ہو جائیں......
میں اور عرشی اس طرح محو گفتگو تھے کہ فہیم ڈرائیور کو ہمراہ لیے ہوئے آئے۔ عرشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''چلو عرشی چلیں مجھے آفس بھی جانا ہے۔''
عرشی ان کے ساتھ کار میں سوار ہو گئیں۔ فہیم نے کار میں بیٹھتے وقت مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ نہ جانے ان نظروں میں کتنے سوال تھے جسے وہ عرشی کے سامنے کہہ نہ سکے۔ میں ساکت ہو کر دور تک ان کی کار کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر مجھے کامران کے اس سوال نے چونکا دیا جو اس نے ابھی تک نہیں کیا تھا...... ''امی امی میرے پاپا کہاں ہیں!''
میں خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد نوٹس بورڈ پر انٹرویو میں کامیاب ہونے والے بچوں کی لسٹ لگی جس میں کامران کا بھی نام تھا۔ حالانکہ یہ قابل مسرت بات تھی لیکن نہ جانے کیوں میرے لب آج مسکرانے سے قاصر تھے۔ میں کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے گھر پہنچی۔ گھر پہنچتے ہی ڈرائنگ روم سے ہوتے ہوئے ابو کے روم میں داخل ہوئی۔ ان کے پلنگ پر بے ترتیب چادر اور اوندھا تکیہ پڑا تھا شاید آج بھی ابو میری فکر

میں رات دیر تک نہیں سوئے۔ اب تو انھیں سمجھانے اور غم غلط کرنے کے لیے امی بھی نہیں رہی۔ وہ ایک سال قبل دل کے مرض سے اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے جہیز میں دیا ہوا ڈبل بیڈ جس کی پالش میں بھی فرق نہیں آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ دن یاد آیا جب وہ گلابوں سے مہک رہا تھا۔ تمام دوست اور ان کی تمام بہنیں فہیم کو چھیڑ رہی تھیں۔ میرا ماضی بھی کچھ کم رنگین نہیں تھا۔ لیکن میرے غرور نے اسے برباد کر ڈالا۔ پلنگ پر بیٹھتے ہی ماضی کی ہر بات رہ رہ کا یاد آنے لگی۔ میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ ٹیچرس کا وہ جملہ...... ''کیا ان کا انتقال ہوگیا۔'' میرے دماغ پر استوار تھا۔ آنکھوں سے آنسو کے قطرے چھلک کر پلنگ پر گرنے لگے اور لبوں نے آہستہ آہستہ سے کہا: ''وہ نہیں مرے بلکہ میں جیتے جی مرگئی''۔

○○○○
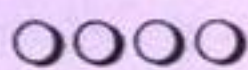
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

راجیش اور کومل دونوں جڑواں بھائی بہن تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ بچپن سے ابھی تک کومل نے بھائی کے ہر دکھ پر آنسو بہائے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن راجیش کے پاؤں پر چوٹ آنے کے باعث خون بہنے لگا۔ راجیش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسی کے ساتھ کومل بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی جیسے اسے بھی چوٹ آئی ہو۔ اسی طرح کومل راجیش کی ہر خوشی پر بھاگ کر دکان پہنچتی اور خوشی خوشی گرم گرم جلیبیاں خرید کر بھائی کو کھلاتی۔ اس کے ماتھے کو چومتے ہوئے خوشی کا اظہار کرتی۔

دراصل یہ دونوں بہن بھائی رمیش نامی ایک غریب مزدور کے بچے تھے۔ ان کی ماں نے سینکڑوں دعائیں کی تھی تب کہیں شادی کے دس سال بعد کملا کی آرزو پوری ہوئی تھی۔ کملا دونوں بچوں کو بہت چاہتی تھی۔ ان کی ہر خواہش پوری کرتی۔ دونوں بچے بھی اپنے والدین کی بہت عزت کرتے تھے کیوں کہ ان دونوں بچوں نے دیکھا تھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ ان کے والدین نے کتنی محنت و مشقت کر کے ان کی ضرورتیں پوری کیں اور پڑھایا لکھایا۔ اسی احساس نے بچوں میں وہ بیداری پیدا کی جس کی بنا پر وہ دونوں ہر سال کلاس میں اول نمبر سے پاس ہوتے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔

راجیش کا میٹرک کا رزلٹ آیا تو وہ فرسٹ کلاس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے فوراً شہر کا رخ کیا۔

شہر میں آکر سیدھا سادہ راجیش ہر ایک کو معصومانہ انداز میں اپنی مارک شیٹ اور سرٹیفکیٹ دکھاتا رہا۔ آخر کار شہر کا ایک ایجنٹ جو کئی بے روزگار بھولے بھالے لوگوں کو اپنے دام میں پھنسا چکا تھا راجیش کو foreign job اور وہاں کی تنخواہ کا ایسا خواب دکھایا کہ بے چارہ گاؤں کا رہنے والا راجیش اس کے جال میں پھنس ہی گیا۔ اس نے مارک شیٹ اور سرٹیفکیٹ کے علاوہ جو کچھ پونجی گاؤں سے لایا تھا سب کچھ اسی ایجنٹ کے حوالے کر دی۔ وہ ایجنٹ راجیش کو چند دنوں کے لیے اپنے گھر میں رکھ کر اس سے گھر کے کام کرواتا رہا۔ آخر پتہ نہیں کیسے ایک دن اس کے دل میں انسانیت نے انگڑائی لی۔ اس نے راجیش کو بلا کر کہا: ”تم کتنے دن ایسا کام کرتے رہو گے۔ تم کو کل میرے دوست کا بیٹا لینے آئے گا۔ وہ تمھیں ایک perfect ڈرائیور بنائے گا۔ تم اس کی ہر بات دھیان سے سمجھنا۔ وہاں foreign میں اچھے ڈرائیوروں کی بہت ضرورت ہے۔ تمھیں وہاں تنخواہ بھی اچھی ملے گی۔“

اس طرح راجیش نے اس ایجنٹ کے گھر رہ کر driving سیکھ لی۔ آج راجیش بہت خوش تھا۔ اسے driving لائسنس مل چکا تھا۔ اب وہ جلد ہی ملک سے باہر روپیہ کمائے گا۔ اپنے گھر والوں کو بھیجے گا۔ اس کے گھر کی حالت میں بہت سدھار آجائے گا۔ کومل بھی ہوسٹل میں رہ کر پڑھ سکے گی۔ راجیش ان ہی خیالات میں ڈوبا رہتا۔ آخر کار ایک دن ایجنٹ نے راجیش کو پاسپورٹ اور viza دیتے ہوئے کہا: ”راجیش اسے سنبھال کر رکھو کل تم صبح کی flight سے دوبئی کے لیے روانہ ہو جاؤ گے۔ وہاں تمھیں میرا دوست ملازمت دلوا دے گا۔ تمھیں وہاں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔“

راجیش اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گاؤں جا کر اپنے گھر والوں سے مل کر لوٹ سکے۔آخر کار راجیش کی بے چینی دیکھ کر ایجنٹ نے گاؤں کے کسی زمیندار کے یہاں راجیش کے گھر والوں کو بلوا کر بات کروا دی۔ راجیش خوشی خوشی دوبئی پہنچا۔باقاعدگی سے اپنے کام کرتا رہا اور جلد ہی اپنے job سے مانوس ہو گیا۔ادھر کومل نے بھی بھائی کی طرح یہی سوچا کہ بہت جلد اس قابل بن جاؤں کہ میرے کمزور والدین کو مزدوری کرنے سے چھٹکارا مل جائے اس لیے اس نے بارھویں پاس کرتے ہی nursing کی ٹریننگ میں ایڈمشن لے لیا۔ حالانکہ راجیش کی بھجوائی ہوئی رقم سے اب گھر کے حالات کافی سدھر چکے تھے۔سب کچھ اطمینان سے چل رہا تھا۔کملا نے بھی مزدوری کرنی چھوڑ دی تھی۔اب وہ اپنے دونوں بچوں کے بیاہ کے متعلق سوچا کرتی۔حالانکہ دونوں بھائی بہن سختی سے کہہ چکے تھے کہ ماں ابھی ہماری شادی کے بارے میں پانچ سال تک بالکل مت سوچنا۔لیکن رہ رہ کر اس کے دل میں ان دونوں کے بیاہ کا خیال جاگتا لیکن بچوں کی ضد کی وجہ سے خاموش ہو جاتی۔ایک دن وہ کچھ ایسی ہی خاموش بیٹھی راجیش کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اچانک اس کے دروازے پر زمیندار صاحب کا لڑکا آیا۔آتے ہی گھبراتے ہوئے کہا: ”چاچی رمیش چاچا کہاں ہیں؟ان سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”رک جا بیٹا میں ابھی اٹھائے دیتی ہوں۔“

پھر زمیندار صاحب کے بیٹے نے رمیش کے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے: ”راجیش کے accident کی خبر سنائی۔

کمزور اور ضعیف رمیش اپنا ماتھا ٹھوکتے ہوئے کہنے لگا: ”بھگوان یہ سب کیسے ہو گیا۔ میری موت کہاں چھپی تھی۔تو مجھے بلا لیا ہوتا۔“

کملا رمیش کی باتیں سن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔اس کے رونے کی آواز سن کر

تھوڑی دیر میں گاؤں کے تمام لوگ اکٹھا ہو گئے۔ ہر ایک راجیش کی موت پر افسردہ تھا۔اس کے آخری دیدار کی تمنا رکھتا تھا۔آخر زمیندار صاحب کے یہاں اسی ایجنٹ نے اطلاع کی کہ راجیش کی لاش اس لائق نہیں ہے کہ دوسرے ملک آسکے۔البتہ اگر اس کے ماتا پتا جانا چاہتے ہیں تو وہ دونوں کو بھجوانے کا انتظام کر سکتا ہے۔آخر سب کی صلاح سے یہ فیصلہ ہوا کہ صرف راجیش کے والدین فوراً سفر کے لیے روانہ ہو جائیں۔ کومل کے امتحانات چل رہے تھے اور نہ ہی اس کو ساتھ لے جانے کے لیے ٹکٹ کا کوئی انتظام تھا۔اس طرح بے چاری کومل ہوسٹل میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ روتی ہوئی رہ گئی۔لیکن ہر رات بھائی کی یاد کرتی رہتی اور پھر نیند کی آغوش میں چلی جاتی۔اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ساتھی اسے طرح طرح سے تسلی اور دلاسا دیتے۔لیکن بھائی کا مسکراتا چہرہ اس کے ذہن سے کسی بھی طرح سے اوجھل نہیں ہوتا۔

اب کومل کی نرسنگ ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرح بہت محنتی تھی اس لیے training مکمل کرتے ہی اسے ایک بڑے دواخانے میں ملازمت مل گئی۔کومل نہایت محنت اور لگن سے خوشی خوشی تمام مریضوں کی دیکھ بھال کرتی۔ ہر ایک مریض اس کے حسن سلوک سے متاثر ہوتا۔اس کے ایک دن نہ آنے پر ہر مریض بس اس کی یاد کرتا۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا۔یہ حقیقت ہے کہ وقت بڑے سے بڑے زخم پر مرہم رکھ دیتا ہے۔دھیرے دھیرے کومل مریضوں کی تیمارداری میں جٹی بھائی کے موت کے غم کو کچھ ہلکا کرنا چاہ رہی تھی کہ اچانک ایک دن اس وارڈ میں جہاں کومل کی ڈیوٹی تھی ایک نہایت خستہ حال مریض accident سے چور چور اس وارڈ میں admit ہوا۔اس کے ماں باپ روتے روتے کومل سے کہہ رہے تھے: ''بیٹی یہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔اس پر دھیان رکھنا۔بھگوان تجھے سکھی رکھے......''

کومل نے سنیل کے والدین کو تسلی دی اور انھیں گھر جا کر آرام کرنے کو کہا۔ آج رات کومل کی night ڈیوٹی تھی۔ وہ اس وارڈ کے تمام مریضوں کو یکے بعد دیگرے دیکھ رہی تھی۔ ضرورت کے مطابق انھیں دوائیاں اور انجکشن دے رہی تھی لیکن بیچ بیچ میں اس کے کانوں میں سنیل کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کومل فوراً اپنے کام انجام دے کر سنیل کے پاس پہنچی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''بھیا ہمت رکھو بھگوان نے چاہا تو آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تمھیں بہت جینا ہے۔ تم ہی اپنے ماں باپ کا سہارا ہو۔'' کومل کی اس آواز نے واقعی سنیل کو ہمت بخشی۔ دن بدن اس کی حالت بہتر ہوتی گئی۔ یہ دیکھ کر کومل بہت خوش تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ سنیل بالکل پہلے کی طرح صحیح و سالم نظر آئے۔

آج صبح بڑے ڈاکٹر صاحب آپریشن تھیٹر میں آئے۔ سنیل کے چہرے سے پٹیاں کھلنے لگی۔ سنیل کے چہرے سے ایک کے بعد ایک پٹی کھلتی جارہی تھی کومل کی نظریں سنیل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جب سنیل کے چہرے سے آخری پٹی ہٹی بے ساختہ کومل نے تھرتھراتی آواز میں کہا: ''میرے راجیش بھیا ارے یہ تو میرے راجیش بھیا ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول چکی تھی کہ چند سال پہلے اس کے والدین راجیش کا انتم سنسکار کر کے لوٹے تھے۔ پاس میں کھڑی ایک ڈاکٹر نے کہا: ''کومل ہوش میں رہو۔ یہ تمہارے بھائی راجیش نہیں بلکہ یہ ہمارا مریض سنیل ہے۔''

یہ سن کر کسی طرح کومل اپنی پرانی حالت میں لوٹی اور اب وہ سنیل کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے لگی۔ اسے سنیل سے ایک خاص لگاؤ سا ہو گیا اور اس کے دل میں سنیل کی خدمت کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا بھائی اس دنیا میں

دوبارہ لوٹ آیا ہے۔ وہ سنیل میں راجیش کو تلاش کرتی رہی اور تن من سے اس کی خدمت کرتی رہی۔ لیکن قدرت نے کومل کو جو خوشی بخشی تھی وہ زیادہ دن نہیں رہی۔ ایک دن نہ جانے کیسے سنیل کی پیشانی پر لگے ہوئے زخم کے ٹانکوں سے خود بخود خون بہنے لگا۔ کومل یہ دیکھ کر تڑپ اٹھی اسے کچھ نہیں سوجھا۔ وہ اپنی ساڑی کے آنچل سے زخموں سے بہتے ہوئے خون کو روکنے لگی۔ چیخ مار مار کر پورے اسپتال میں بڑے ڈاکٹر صاحب کو تلاش کرتی رہی۔ اتفاق سے بڑے ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ نہ مل سکے تو جوان کا اسسٹنٹ تھا آگے بڑھا اور معائنے کے بعد کومل کو بتایا کہ اس مریض کا بچنا مشکل ہے۔

سنیل نے اشارے سے کومل کو پاس بلایا اور آہستہ آہستہ کومل سے کہنے لگا: ''کومل تم نے میری بہت سیوا کی۔ ایک نرس کی طرح نہیں بلکہ ایک بہن کی طرح۔ اب تم مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم میری موت پر ایک بھی آنسو نہیں بہاؤ گی۔ بلکہ ایک مضبوط چٹان بن کر میرے ماتا پتا کو تسلی دینا۔'' اتنا کہہ کر سنیل نے کومل کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

ایک طرف یہ منظر تھا کہ کومل بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے سنیل کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی تو دوسری طرف اسسٹنٹ ڈاکٹر چیخ مار مار کر کومل کو بلا رہا تھا: ''کومل میں کب سے تم سے کہہ رہا ہوں کہ سنیل کے خاندان والوں کو یہاں بھجواؤ اور ان سے کہو کہ وہ ہمارا بل ادا کرے اور بعد میں لاش لے جائے۔''

کومل گاؤں کے سیدھے سادے ماحول کی پروردہ تھی۔ اس کا دولت کے بھوکے انسانوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اس بے مروت ڈاکٹر کو تکتی رہی۔ پھر یا بھگوان کہہ کر ایک سرد آہ بھری اور بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ اس کی بے ہوشی کو دیکھتے ہوئے اس کی ایک نرس سہیلی نے کہا: ''کومل گاؤں کی رہنے والی سیدھی سادی

لڑکی ہے وہ شاید یہ نہیں جانتی کہ بڑے شہروں اور بڑے بڑے دواخانوں میں کیا چل رہا ہے۔کیسی لوٹ مچی ہے۔ یہاں تک کہ مردہ لاشوں کو زندہ کہہ کر موٹی موٹی رقم وصول کی جارہی ہے۔ایک دور تھا جب مریض کے لیے ڈاکٹر بھگوان ہوتا تھا اور ڈاکٹر مریض کی شفا کے لیے فکر مند ہوکر دعائیں مانگتا تھا۔اب تو صرف ڈاکٹر مریض اور اس کے رشتہ داروں سے علاج سے قبل ہزاروں اور لاکھوں کی بولی بولتے نظر آتے ہیں۔''

OOOO

دعا

ابھی شام ڈھلنے ہی والی تھی کہ لوگ مغرب کی نماز ادا کرتے ہی مسجد کے صحن کے اطراف عید کا چاند دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو گئے۔ اس بھیڑ میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا: ''دیکھو وہ نیم کے درخت کے پیچھے چاند کیسا باریک نظر آرہا ہے!''
جیسے ہی انھوں نے کہا چاند نظر آرہا ہے تمام نظریں اسی طرف مرکوز ہو گئیں۔ ہر ایک نے کہا: ''حضرت نے درست فرمایا ۲۹ واں چاند نہایت باریک نظر آرہا ہے۔''
پھر سب نے چاند دیکھنے کے بعد ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا: ''چاند نظر آ گیا ہے چلو عید کی تیاری میں جٹ جاؤ۔''
چاند نظر آنے کی خوشخبری سنتے ہی میری بیٹی دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آکر کہنے لگی: ''امی سنئے یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ واقعی چاند نظر آ گیا۔ کل کی عید ہے۔ ابھی تو کتنے کام باقی ہیں۔ کیسی ہوں گی ایک رات میں ساری تیاریاں؟ دیکھنا امی ہم کو بہت رات تک جاگنا پڑے گا تب کہیں سارے کام ہو سکیں گے۔''
وہ ایسی کتنی ہی باتیں کہے جا رہی تھی لیکن جب تک میرے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکلا تو ذرا بلند آواز میں کہا: ''امی میں کچھ کہہ رہی ہوں جب سے آپ ہسپتال سے لوٹی ہیں کھوئی کھوئی سے دکھائی دے رہی ہیں کچھ بولتی ہی نہیں۔ آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آخر

آپ نے وہاں ایسا کیا دیکھ لیا ہے جس کی وجہ سے آپ بدحواس ہوگئیں ہیں۔ کل عید ہے اور آپ کو کچھ فکر ہی نہیں۔"

میں نے اپنی بیٹی کو اپنے قریب بٹھایا اور آہستگی سے کہا: "تمہاری صالحہ اپی پاگل ہوگئی ہیں۔ بیٹا تمام ہسپتال اس کی چیخ و پکار سے گونج رہا ہے۔ ہر گذرنے والے شخص کے قدم اس کی آواز پر تھوڑی دیر کے لیے تھم جاتے ہیں۔ اس بچی کی بے قرار آواز پر سب ہی کف افسوس مل کر رہ جاتے ہیں۔ خدا سے دعا کرو میری بچی۔ اللہ کرے صالحہ کی حالت بہت جلد درست ہو جائے۔"

یہ سب سن کر بیٹی نے حیرت سے پوچھا: "آخر امی ابھی تو آپ کے عمرہ سے لوٹنے کے بعد وہ گھر آئیں تھیں۔ اچھی بھلی تھیں۔"

"ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

میری نظروں کے سامنے صالحہ کا ایک مہینے پہلے کا چہرہ گھومنے لگا۔ بالکل وہ میری بیٹی کی طرح مجھ سے یکے بعد دیگرے مکہ، مدینہ اور کعبہ شریف کے متعلق کتنے سوال کر رہی تھی۔ میں اس کے ان سوالوں میں سے بہ مشکل ایک دو کا جواب دے سکی تھی۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے بعد ملنے والوں کی قطار لگ گئی تھی۔ ایک کے لوٹنے کے بعد دوسرے حاضر۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ہر شخص ۱۰-۱۵ منٹ ملنے کے بعد لوٹ رہا ہو۔ ہر شخص اس دن فرصت میں نظر آ رہا تھا۔ ملنے والے کئی اور میں خود اکیلی۔ کئی لوگ قسم قسم کے سوالات کر رہے تھے اور میں تھکی آواز میں جواب دے رہی تھی۔ اسی دوران پرانے محلے میں پڑوس میں رہنے والی بچی صالحہ داخل ہوئی۔ آتے ہی گلے ملنے کے بعد کئی سوال پوچھنے لگی۔ میں نیند کی غنودگی میں بہ مشکل ایک دو سوالوں کا جواب دے سکی۔ لوٹتے وقت اس نے مجھے التجا بھری آواز میں کہا: "خالہ جان پلیز میرے لیے دعا کیجئے نا...... اللہ مجھے کعبہ شریف کا دیدار کرائے۔ وہاں جانے کی میری بڑی تمنا

ہے۔آپ تو ابھی وہاں سے لوٹی ہو انشا اللہ آپ کی دعائیں جلد قبول ہوں گی۔''
میں نے صالحہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''ہاں بیٹا میں نے وہاں بھی ہر شخص کے لیے یہی دعا مانگی ہے کہ اللہ ہر ایک کو جس کے بھی دل میں حاجی بننے کی خواہش ہے ضرور پوری کرے۔ بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

دراصل صالحہ ہمارے پرانے پڑوسی کی بچی تھی۔ بچپن ہی میں والدہ کا انتقال ہو گیا تھا وہ زیادہ تر اپنا وقت ہمارے یہاں ہی گذارتی تھی وہ نہایت دیندار گھرانے سے تھی اس کے والد اور بھائی سب ہی متقی و پرہیز گار تھے صالحہ بھی بالکل اپنے نام کی طرح اسم با مسمیٰ تھی۔ نہایت نیک خدمت گذار، ہمدردی اور خلوص جیسے اس کے رگ رگ میں سمایا ہوا تھا میرے عمرہ جانے والے دن خود سے میرے بغیر کچھ کہے گھر آ گئی تھی یہ کہہ کر کہ مجھے خالہ جان کی تیاری کی فکر تھی اور میرے لوٹنے تک ہر ایک سامان دھیان سے باندھ رہی تھی۔ ہر ایک کام میں میری بیٹی رفعت کی مدد کر رہی تھی۔

ابھی کچھ دن پہلے شہر میں فساد ہوا تھا۔ بازار میں بم دھماکہ ہونے کے باعث کافی جانی مالی نقصان ہوا۔ دھماکہ کرانے والے پکڑے تو نہیں گئے لیکن محض شک کی بنیاد پر چند نوجوانوں کے چہرے داڑھی سے آراستہ تھے مشکوک نظروں سے دیکھے جانے لگے اسی دوران صالحہ اپنے بھائی کے ساتھ کسی ضروری کام سے باہر نکلی تھی۔ پولس والوں نے تلاشی کے لیے انھیں روکا پہلے بھائی کی خوب جانچ پڑتال کی پھر صالحہ کا نقاب اتروایا اور بار بار اس کے منع کرنے کے باوجود اس کی تلاشی لی۔ ان کی اس حرکت پر صالحہ احتجاج کر رہی تھی: ''محض میرے بھائی کے داڑھی والے چہرے کو دیکھ کر آپ اسے دہشت گرد سمجھ رہے ہیں۔ یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہمارا دہشت گردوں سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ اس طرح کا سخت برتاؤ مت کیجیے۔''
لیکن انھوں نے ایک نہ سنی خوب ٹھوک بجا کر تلاشی لینے کے بعد ان دونوں کو رہا کیا۔

صالحہ تمام راستے بھائی سے بڑبڑاتی رہی۔ گھر آتے ہی دیوار سے سر ٹکراٹکرا کر کہتی رہی میرے جسم کو ان بے رحموں نے ہاتھ لگایا اس سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی۔ اس کی یہ حرکت دیکھتے ہوئے بھائی نے ڈاکٹر کو بلایا۔

ڈاکٹر نے تفتیش کرتے ہی کہا: "یہ بچی اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے فوراً اسے ہسپتال میں بھرتی کروادو۔"

بھرتی ہونے کے بعد صالحہ ہر ایک کو دیکھ کر یہی کہہ رہی ہے: "دیکھو آپا تمہارے جسم کو کوئی غیر مرد چھو نہ لے۔ روڈ سے سنبھل کر جانا ...... یہ لوگ بہت سفاک ہوتے ہیں......"

"بیٹا جب سے میں اس بچی کی حالت دیکھ کر لوٹی ہوں سوچ رہی ہوں کہ روزے کی حالت میں ایک پرہیز گار عورت کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا۔ ایک دین کے راستہ پر چلنے والے نوجوان کو کس قدر مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا...... دہشت گرد یہ لفظ کب؟ کیوں اور کیسے اسلامی بھائیوں کے ساتھ جڑ گیا جبکہ مذہب اسلام تو سراسر سلامتی کا مذہب ہے۔ ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہی ایک بھائی دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتا ہے۔ بھلا ایسے مذہب سے تعلق رکھنے والے دہشت گرد کیسے ہو سکتے ہیں...... ہاں چند سر پھرے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں...... جوش میں ہوش کھونے والے اپنے مفاد کی لالچ میں ایسی نیچ حرکتیں کر کے قوم و سماج کے وقار کو کھو دیتے ہیں۔ اس کی حرکتوں پر تمام قوم کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اس قوم کا ہر شخص مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر ایک کو ایک ہی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ افسوس ہے ان کی لالچ پر، ان کی حرکتوں پر جو ظالمانہ حرکتوں کو جہاد کا نام دیتے ہیں جو انجام سے بے خبر ہوتے ہیں وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کی ایسی حرکتیں قوم کے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہونگی۔ کئی خاندان لٹ جائیں گے۔ برباد ہو جائیں گے۔ فساد برپا ہونگے۔ ان

فسادوں میں چور، ڈاکو، بدمعاش خوب ہاتھ دھوئیں گے۔ گھر، بازار، دکانیں سب لٹ جائینگی۔ غریبی کا راج ہوگا۔ کئی سال تک زندگی معمول پر نہیں آئے گی۔ سفاکی کے درد ناک سائے تلے جینا مشکل ہو جائے گا تو آوارگی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ لوگ موقعہ کا فائدہ اٹھا کر نیچ حرکتیں کریں گے جیسے کہ صالحہ کے ساتھ ہوا۔
ابھی اس کی چیخیں میرے دماغ سے نہیں نکلیں اس کی بے قرار حالت کے متعلق سوچ سوچ کر میرے آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ میں اپنے معبود کے سامنے سر بہ سجود ہو کر دعا مانگنے لگی: ''میرے خدا میری قوم کو ایسی ہدایت دے کہ ان کی شناخت دیگر اقوام کے سامنے ایسی ہو کہ ہر کوئی یہ سوچے کہ دہشت گردی سے اس قوم کا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ واقعی یہ ایک سلامتی کی راہ پر چلنے والی قوم ہے۔''
کاش میری قوم اپنی یہ پہچان بنا سکے۔ یہی دعا میرے دل سے گڑگڑا کر نکل رہی ہے۔ صالحہ کی صحت کے لیے میرے لرزتے لب اور تھرتھراتے ہاتھ کئی بار دعا مانگ رہے ہیں۔

OOOO

یادیں

مجھے میری تحسین خالہ بے حد عزیز تھیں۔ میں انھیں بہت پسند کرتی تھی۔ہم دونوں کا رشتہ خالہ اور بھانجی کا تھا لیکن اکثر دونوں راز داری کی باتیں کیا کرتے۔ وہ خوب صورت اور خوب سیرت تھیں۔ ان کی زندگی جوش ولولوں اور مسرت سے لبریز تھی۔ نہایت سمجھدار اور دور اندیش تھیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا گویا ان کے دل میں کتنے ارمان مچل رہے ہیں اور کتنی خواہشیں جنم لے رہی ہیں۔وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھیں۔نانی جان نے کبھی ان کی کسی آرزو کو رد نہیں کیا تھا۔وہ جو بھی سیکھنا چاہتی، جو بھی بنانا چاہتی نانی جان انھیں کرنے دیتیں۔یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کم عمری اور کم وقت میں مختلف کاموں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ پڑھائی کے میدان میں بھی پیچھے نہیں رہی۔انھوں نے اچھے نمبرات سے ایم اے اور بی ایڈ کے امتحانات پاس کئے۔

ان دنوں نانی جان کے یہاں خالہ کے رشتہ کے لئے لوگوں کا ہجوم تھا پھر ایک اچھا رشتہ دیکھ کر نانا جان نے بات پکی کر لی۔نانا جان ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں اچھی خاصی رقم حاصل ہوئی تھی۔اس لیے نانی جان کے یہاں بہت جلد تحسین خالہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جب خالہ نے سسرال میں قدم رکھا وہاں صرف تین افراد تھے۔ساس سسر اور ان کے شوہر۔نہ چھوٹی نند تھی، نہ دیور۔ جو بھابی

کہہ کران کے پیچھے لپکتے انھیں چھیڑتے۔ چند دن ان کے جیٹھانیوں کے بچے انھیں گھیرے رہے پھر کچھ دنوں بعد وہ سب اپنے اپنے شہر لوٹ گئے۔ ان سب کے لوٹنے کے بعد خالہ اکیلی رہ گئیں لیکن انھوں نے کبھی بوریت محسوس نہیں کی۔ بیشتر کاموں کی ذمہ داریاں جو ان کی ضعیف ساس کی نظر سے اوجھل تھیں اپنی سمجھ سے، خوش دلی سے انجام دیتیں۔ وہ گھر کے چھوٹے بڑے کام خود انجام دیا کرتی تھیں۔ ان کاموں کے لیے نوکروں پر منحصر رہنا انھیں پسند نہ تھا۔

پھر کچھ دنوں بعد خالہ کو ملازمت کا جنون ہوا۔ ان کی یہ خواہش بھی پوری ہوگئی اور انھیں ایک اچھی اسکول میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت ملنے کے بعد ان کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی۔ اب ان کی ضعیف ساس زیادہ تر بیمار رہنے لگی لیکن خالہ حالات سے سمجھوتہ کرنا بخوبی جانتی تھیں۔ ان حالات میں بھی ان کے قدم ڈگمگائے نہیں اور نہ ہی ان کی پیشانی پر بل آئے۔ وہ والدین کے لیے جتنی خدمت گذار بیٹی تھیں سسرال میں ساس سسر کے لیے اتنی ہی خدمت گذار بہو ثابت ہوئیں۔ وہ یہ جانتی تھیں کہ عورت کے روپ مختلف دور میں مختلف ہوتے ہیں۔ ذمہ داریاں اس سے جڑی ہوتی ہیں جنھیں نبھانے کے لیے اسے تیاگ تپسیا اور قربانی کی مورت بننا پڑتا ہے۔ سب کچھ نچھاور کر دینا پڑتا ہے۔ اسی خلوص، اپنائیت اور قربانی کی بدولت اسے سماج اور خاندان میں عزت اور ایک خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔ وہ سب کی آنکھوں کا تارا اور مثال بنتی ہے۔ خالہ اپنی ساس کے لیے اچھی بہو تو ثابت ہوئیں لیکن ان کے شوہر نے کبھی ان کے درد کو سمجھا ہی نہیں۔ ہر وقت انھیں سروس کا طعنہ دیتے رہے۔ ''میرا تو سروس کرانے کا ارادہ نہیں تھا۔ تم اپنی حالت کی خود ذمہ دار ہو۔'' خالہ یہ سب سن کر صبر کے گھونٹ پی کر خاموش رہتیں۔ اُف نہ کرتیں، میں ایک ایک ہفتہ خالہ کے یہاں رہا کرتی تھیں ان کی ہر سرگرمی سے باخبر تھی۔

اسی طرح دن گذرتے گئے۔ اسی دوران خالہ دو بچوں کی ماں بن گئی۔ اب تو ان کے یہاں ماحول میں عجیب وغریب تبدیلیاں آ گئیں۔ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے والی میری خالہ گھر اور باہر کے مختلف کاموں کی مشغولیت سے چڑچڑی سی ہو گئیں۔ مختلف بیماریوں نے اپنا جال پھیلانا شروع کیا۔ وہ خالہ جنھیں میں نے دو روز کے مرض میں کبھی مبتلا نہیں دیکھا تھا وہ اب بیمار رہنے لگیں لیکن ان کے کام کرنے کے انداز ورفتار میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی وہ مختلف لذیذ پکوانوں سے خاندان والوں کی ضیافت کرتیں۔ بڑے خلوص ومحبت سے مہمانوں کا استقبال کرتیں تھی۔

وقت گزرتا گیا خالہ کے بچوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ خالہ کچھ تو بیماری کے باعث، کچھ مصروفیات اور کاموں کے بوجھ تلے دب کر ضعیف اور کمزور نظر آنے لگیں۔ آخر ایک دن وہ کچھ اس طرح بیمار ہوئیں کہ انھیں ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا۔ کچھ دنوں بعد جب وہ ہسپتال سے گھر لوٹیں ان کی عیادت کے لیے جو بھی عورتیں آتی انھیں بہو لانے کی صلاح دیتی۔ ان کے بیٹے نے کسی امیر گھرانے کی لڑکی پسند کر لی تھی۔ اس وقت اس نے یہ نہیں سوچا کہ اس کی شریک حیات گھر کی ذمہ داریاں سنبھال سکے تا کہ زندگی کی گاڑی درست طور پر چل سکے۔ گھر میں آنے والی لڑکی والدین اور خاندان کے ماحول کے مطابق ہو۔ بس جوانی کے جوش میں اپنی خواہش کو مقدم اور اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔ کسی طرح اپنی والدہ کو اس رشتے کے لیے راضی کر لیا۔ بیٹے کا مصمم ارادہ دیکھ کر خالہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکی کے لیے تیار ہو گئیں۔ خالہ نے بہو کے روپ میں جس طرح کی لڑکی کے لیے سپنے سجائے تھے، سب علیحدہ کر کے اپنے ارمانوں اور خواہشوں پر بیٹے کی خواہش کو اولیت دی کسی طرح خالو جان کو بھی اس رشتہ کے لیے تیار کر لیا اور پھر شادی کی تیاری میں جٹ گئیں۔

شادی تو ہو گئی۔ گھر میں بہو بھی آ گئی لیکن خالہ کے مزاج اور ان کی عادتوں کے بالکل

خلاف تھی۔ جو کام خالہ خوش دلی سے انجام دیتی تھی، وہ کام بوجھ سمجھ کر انجام دیا جانے لگا۔ اکثر کاموں کے لیے نوکروں پر منحصر رہنے لگیں۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے نوکروں کا انتظار کیا جانے لگا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ خالہ کے ہاتھوں سے سجا سجایا گھر کباڑ خانہ بن گیا۔ قیمتی قیمتی چیزوں پر دھول کی تہہ چڑھنے لگی۔ خالہ یہ سب خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ گھر میں ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے اس لیے کچھ نہ کہہ سکیں۔ خالہ کی بے بسی اور مجبوری کا اندازہ میں بخوبی لگا رہی تھی۔ انھیں بعض اوقات کڑھتے ہوئے دیکھ کر میں ان سے کہتی: ''خالہ جان اپنی صحت کا خیال رکھئے جو کچھ جیسا چل رہا ہے ویسا ہی چلنے دیجئے۔''

ایک دن گھر کے حالات دیکھ کر وہ چپکے چپکے بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگیں: ''میں اللہ سے دعا مانگتی ہوں، اے اللہ مجھے صبر کی توفیق دے۔''

ایک دن جب میں ان کے یہاں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر وہاں رکھی ہوئی چیزوں کا معائنہ کر رہی تھی انھوں نے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا: ''بیٹا کیا دیکھ رہی ہو۔ اللہ کی یہی مرضی تھی، مجھے تو لگتا ہے اس گھر سے میرے مرنے کے بعد صاف صفائی کا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔'' خالہ نے اس جملے کو کتنے کرب اور درد کے ساتھ ادا کیا تھا میں اسے محسوس کر رہی تھی۔

لوگ کہتے ہیں دنیا کے کاروبار کسی انسان کے گذر جانے کے بعد نہیں رکتے۔ دنیا اسی طرح چلتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کبھی کبھی بہت کچھ فرق پڑتا ہے۔ بعض سلیقہ مند، محنتی عورتیں اس دور میں اس نئی نسل کے ہاتھوں اپنے ماضی پر غور کر کے پریشان زندگی جینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اصول پرست، سلیقہ شعار عورتوں کے لیے ایسی مجبور زندگی کسی عذاب سے کم نہیں۔ وہ جیتے جی آدھی مر جاتی ہے۔ نئی نسل کے لوگ جو ہر کام کے لیے نوکروں پر منحصر رہتے ہیں پانچ منٹ کے کام کو وہ خود نہیں کر سکتے۔

مجھے خالہ کے یہاں کے ماحول میں کافی تبدیلی نظر آئی۔ وہ خالہ جو کام خوشدلی سے اپنے ہاتھوں سے خود کرتی تھیں وہ نوکروں کے حوالے ہونے لگے۔ خالہ نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی، کڑھائی کی ہوئی بہت ساری چیزیں مجھے تحفتاً دیتے ہوئے کہا: ''بیٹا صرف تو ہی ان کی اہمیت سمجھ سکتی اور ان چیزوں کو احتیاط سے استعمال کر سکتی ہے۔''

خالہ پرانی باتوں کو یاد کر کے ہر بات پر رو رہی تھی، پچھتا رہی تھیں اور میں انھیں ہر طرح سے تسلی دے رہی تھی: ''خالہ بھول جاؤ ان باتوں کو، بس اب اپنی صحت کا خیال رکھو، خالو جان پر نظر ڈالو وہ آپ کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

اس طرح خالہ کی بکھری ہوئی زندگی دیکھ کر بجھے بجھے دل کے ساتھ خالہ کے شہر سے لوٹی...... ابھی خالہ کی طبیعت دیکھ کر لوٹے ہوئے مجھے دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اچانک امی نے فون پر خالہ کے انتقال کی اطلاع دی۔ لاکھ کوشش کے باوجود میرا ان کی آخری رسومات میں شریک ہونا ممکن نہ ہو سکا...... چند دنوں بعد میں خالہ کے یہاں پہنچی۔ یہاں قدم رکھتے ہی میں نے یہاں کا ماحول بالکل بدلا ہوا پایا۔ ان کا پوتا جسے وہ گھنٹوں گود میں لیے رہتی تھیں۔ اس بچے کے لیے دادی کی گود کسی درسگاہ سے کم نہیں تھی۔ اب اس بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایک جاہل خاتون مقرر ہے۔ وہ کیا بچے کی تربیت کرے گی۔ وہ تو صرف چند گھنٹے بچے کے ساتھ گزار کر اپنی تنخواہ لے کر لوٹنا جانتی ہے۔ مہمانوں کی ضیافت کے لیے ہوٹل کے دروازے کھلے ہیں۔ خلوص اور اپنائیت سے ان کی بہو کو کچھ سروکار نہیں۔ وہ کسی طرح ہر کام کو ٹالنا جانتی تھی۔ خالہ کے گھر میں میں نے اس بار عجیب عجیب سی تبدیلیاں دیکھیں۔ گھر کے افراد سے زیادہ ان کے گھر میں خادم نظر آنے لگے۔ وہ خالہ جنھوں نے اس گھر کو سلیقہ سے رکھنے، سجانے سنوارنے میں اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا آج اس گھر پر خادموں کا راج ہے جس کا

دل جو چاہتا ہے وہ فرمائش کر کے اسے لے جاتا ہے۔ گھر کی ہر چیز بکھری اور دھول سے لپٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یہ تمام نظارہ دیکھ کر مجھے خالہ کا وہ جملہ یاد آیا جو انھوں نے دور اندیشی کے لحاظ سے مذاق کے طور پر کہا تھا: ''بیٹا میرے جنازے کے ساتھ اس گھر سے صاف صفائی کا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔''

واقعی ایسا ہی ہوا۔ خالہ کا وہ گھر جس کی ایک ایک چیز میں خالہ کی پسند جڑی ہوئی تھی ان کی خواہشوں اور ارمانوں سے بنے ہوئے اس مکان کے انتظامات کا اگر یہی حال رہا تو قریب ہے کہ یہ گھر کھنڈر کی شکل اختیار کر لے گا اور پھر خالہ کی بہو کسی نئے فلیٹ میں مقیم ہو جائے گی یہ کہہ کر کہ ''اتنے بڑے مکان کی صفائی مجھ سے ناممکن ہے۔'' ہاں! یہ فلیٹ گھر ضرور ہوگا لیکن اپنائیت اور خلوص سے خالی ہوگا۔ ہر آنے جانے والا اس فلیٹ میں ٹھہرنے سے پہلے کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔ خالہ کی ہر ادا فریاد بن کر ان کے ماضی کی داستان سنائے گی اور اس دور کو یاد کرے گا جس دور میں خالہ جیسی عورتیں جنم لیتی تھیں جو صرف اپنے لیے جینا نہیں جانتی تھیں بلکہ خدمت خلق ان کی زندگی کا اولین مقصد ہوتا تھا۔ ہر وقت یہی سوچتی تھیں کہ اپنی ذات سے کسی کو خوشی پہنچانا کسی عبادت سے کم نہیں۔ مجھے خالہ کی بے حد یاد آرہی تھی۔ پھر خالہ کے یہاں کے ڈرائیور نے کسی طرح مجھے ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دیا اور میں بوجھل قدموں سے کسی طرح ریل کے ڈبہ میں سوار ہوئی۔ ریل نے سیٹی بجائی اور میں خالہ کی یادوں میں کھو گئی۔ جب ریل چھوٹتے وقت خالہ خدا حافظ کہنے کے لیے اور میرے بچوں سے ہاتھ ملانے کے لیے بے قرار رہتیں تھی، اب کب آئے گی بیٹا یہ تمام باتیں یاد کر کے میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ میں خالہ کی یادوں کا دفتر لیے اپنے گھر پہنچی۔

OOOO
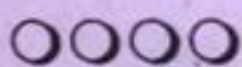
احساس

ابھی صبح ہو چکی تھی۔ دھوپ کی تمازت دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ ہم لوگ جیسے ہی دوبئی سے ہندوستان پہنچے۔ ہمارے ڈرائیور کے چہرے پر میں نے افسردگی دیکھی۔ وہ آہستہ آہستہ ہمارا سامان کار میں رکھنے لگا۔ اس کی یہ افسردگی میری بے قراری کا سبب بن گئی۔ آخر کار میں نے اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی تو اس نے مغموم لہجہ میں کہا:
''باجی اب آپ سے کیا کہوں، بس اسے اللہ کی مرضی سمجھئے جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس ہفتے ہمارے محلے سے تین لوگ ایک ایک دن کے وقفہ سے اس دنیا سے چل بسے۔ میں اسی غم میں ڈوبا ہوا ہوں۔''

میں نے فوراً پوچھا: ''یہ تین لوگ کون ہیں؟''

ڈرائیور نے ان کے نام بتائے۔ یہ نام سنتے ہی میں نے دل کو تھام لیا۔ میں نے اپنے شوہر عارف سے کہا: ''ہم آج ہی پرسے کے لیے ان کے گھر جائیں گے۔'' پھر دو تین گھنٹے آرام کرنے کے بعد ہم لوگ ڈرائیور کو ساتھ لیے ان کے گھر گئے۔

سب سے پہلے ہمارے محلے کے بزرگ فاروق صاحب کے گھر گئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ چھ مہینے پہلے ان کو ڈاکٹر نے کینسر جیسے مہلک مرض کی اطلاع دے دی تھی۔ ان کا مرض آخری مرحلے پر پہنچ چکا تھا۔ خاندان کے بیشتر لوگوں نے اس بات کے لیے اپنا

ذہن تیار کر لیا تھا کہ فاروق صاحب اس دنیا میں چند دنوں کے مہمان ہیں۔ اکثر لوگ ان کی حیات میں ان سے مل کر انھیں صحت مند ہونے کی جھوٹی تسلی دے رہے تھے کیونکہ فاروق صاحب نے ابھی تک اپنی جائیداد کا بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے خاندان کے کافی افراد دل و جان سے ان کی خدمت میں جٹے ہوئے تھے۔ اس توقع میں کہ شاید ان کی خدمت سے متاثر ہو کر فاروق صاحب اپنی جائیدار کا ایک بڑا حصہ ان کے نام لکھ دے...... آہستہ آہستہ فاروق صاحب کی صحت گرتی گئی لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی جائیدار کا کوئی بٹوارہ نہیں کیا اور ایک دن وہ اس دنیا سے چل بسے۔

فاروق صاحب کا انتقال ہوئے ابھی صرف تین دن ہوئے تھے۔ تمام گھر رشتہ داروں سے بھرا تھا، چھوٹے بڑے مرد عورتیں تمام گھر میں اکٹھا تھے۔ گھر کے ایک بڑے کمرے میں جائیداد کے بٹوارے پر بحث چل رہی تھی۔ بلند آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ ایک کمرے میں پکوانوں کے طور طریقے پر چرچا شروع تھی۔ اسی سے متصل کمرے سے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ وہاں بیت بازی کا مقابلہ چل رہا تھا۔ نوجوان بچے نئی فلم دیکھنے کے لیے بضد تھے جبکہ گھر کے بزرگ اس کے لیے انھیں روک رہے تھے۔ مختصر یہ کہ ایسا کہیں سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ دو دن پہلے اس خاندان کے کسی بزرگ کا انتقال ہوا ہے۔

میرے داخل ہوتے ہی فاروق صاحب کی بیوی اپنے چہرے پر اداسی کے تاثرات لاتے ہوئے کہنے لگی: ''بیٹا تمہارے خالو جان بڑی تکلیف میں تھے۔ وہ تو اچھا ہوا اللہ نے انھیں جلدی سے اپنے پاس بلا لیا۔ اس طرح انھیں تکلیف سے نجات تو مل گئی۔''

میں نے بھی ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: ''ہم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی فکر ہوتی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔'' اس طرح چند تسلی بخش

جملے کہتے ہوئے میں فاروق صاحب کے گھر سے باہر نکلی۔

ڈرائیور نے دریافت کیا: ''اب کہاں چلنا ہے۔''

میں نے کہا: ''روبینہ باجی کے یہاں چلتے ہیں۔ جواب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ مجھے تو اس دن یہ سن کر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کیسے انھوں نے خودکشی کرلی؟ بے چاری شوہر سے بہت پریشان تھیں کئی دنوں سے خود محنت کر کے گھر چلا رہی تھیں۔''

روبینہ باجی دراصل ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی شادی ایک آٹو ڈرائیور سے ہوئی تھی۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ سب ہی ڈرائیور ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ ڈرائیوروں کے بچے پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر خاندان کا نام روشن کرتے ہیں لیکن چند ڈرائیور بری عادتوں کے شکار ہوتے ہیں۔ وہ ہر برے شوق کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ دن بھر کی کمائی جوئے اور شراب میں اڑا کر خالی ہاتھ گھر پہنچتے ہیں۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ گھر جا کر مرد ہونے کا گھمنڈ دکھاتے ہیں۔ نشہ میں چور بیوی سے گالی گلوچ کرنا، بیوی کو مارنا، گھر کے بزرگوں کو ترش جواب دینا، سامان پھینکنا ایسی بری عادتوں کے وہ عادی ہوتے ہیں۔ روبینہ باجی کے شوہر بھی انھی بری عادتوں کے مالک تھے۔ وہ بہت دنوں سے اپنے شوہر کی عادتوں سے پریشان ہو کر بچوں کی خاطر مجبور زندگی جی رہی تھیں۔ آخر کار ایک دن پریشان ہو کر اور ظلم وستم سے تنگ آ کر روبینہ باجی نے خودکشی کرلی۔ ان کے اس عمل نے ان کی تمام اچھائیوں پر پردہ ڈال دیا۔ اہل خاندان بھی دیگر لوگوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہنے لگے:

''روبینہ نے یہ کام اچھا نہیں کیا۔''

انتقال کے ایک دن پہلے ان کا اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا اور اس دن شوہر کا ظلم و ستم حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ یہ ذلت برداشت نہ کرسکیں۔ عقل پر غصہ نے فوقیت

پائی۔ بچوں کے مستقبل سے بھی اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ بس ان کے دماغ میں ایک ہی جنون تھا مجھے اس دنیا سے جتنی جلد ہو سکے چلے جانا ہے۔ ایسی حالت میں اس دنیا میں رہ کر کیا فائدہ؟ اور انھوں نے وہی کیا جو ان کے دماغ میں بس گیا تھا۔

یہاں ہر کوئی روبینہ باجی کی موت کا ذمہ دار خود ان کو ہی ٹھرا رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ: ''اتنا بڑا اقدم اٹھاتے وقت اس نے بچوں کا ذرا بھی خیال نہیں کیا۔''

روبینہ باجی کے گھر پہنچتے ہی ان کی ضعیف والدہ مجھ سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگیں: ''میری بیٹی روبینہ اب اس دنیا میں نہیں۔ بڑی تکلیفیں جھیلیں ہیں اس نے۔ مجھے اس کے رشتے کے وقت ہی لوگ سمجھا رہے تھے۔''

روبینہ باجی کی والدہ کو روتے ہوئے دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے یاد آیا جب بھی مجھے جلدی میں دوبئی جانا ہوتا وہ فوراً میرے کپڑے سی دیتی تھیں۔ میں ماضی کی ہر بات یاد کرتے ہوئے اور آنسو پوچھتے ہوئے باہر نکلی۔

ڈرائیور نے کہا: ''باجی جلدی چلئے۔ ابھی ہمیں گڈو بھائی کے یہاں بھی جانا ہے۔ جو اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔''

یہاں پہنچتے ہی میں نے ایک عجیب سا سناٹا دیکھا جو تمام ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ گڈو کے گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا ایک عجیب سے پژمردگی اور اداسی ہے جو ہر دل پر چھائی ہوئی ہے۔ گویا گڈو کی موت نے کئی دلوں کو ویران کر دیا ہے۔ یہاں ہر شخص گڈو کے ایک ایک کام کو یاد کر کے رو رہا تھا۔ گڈو غریبوں کے لیے بھگوان تو بزرگوں کے لیے مسیحا تھا اور بچوں کے لیے ہیرو۔ وہ ہر ایک کا کام اتنی لگن اور خوشدلی سے انجام دیتا جیسے وہ کام خود اس کا ہو۔ اس عظیم انسان کی موت ایک حادثہ میں اچانک ہوئی تھی۔ اپنے اخلاق اور طرز سلوک سے اس نے لوگوں کے دلوں میں جگہ

بنائی تھی۔ ہر ایک کا کام بغیر معاوضہ کے اپنے ذمہ لے لیتا اور حسن و خوبی سے خوشی خوشی انجام دیتا۔ چاہے بچوں کو اسکول چھوڑنا ہو، بازار سے کچھ لانا ہو یا کسی بزرگ کا کوئی کام ہو۔ اس کی اچانک موت نے کئی دلوں کو ہلا دیا۔ اس دن محلے کی کوئی دکان نہیں کھلی۔ ہر گھر میں اداسی و خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو آنسوؤں سے لبریز نہ ہو۔ ہر کوئی اس کی موت کی خبر سن کر ششدر تھا۔ یہی کہتا: ''کیا بات کر رہے ہو۔ میں نے کل ہی اسے دیکھا تھا۔'' کوئی کہتا: ''کل تو وہ ہمارے گھر آیا تھا۔'' کوئی کہتا: ''کیا نیک بچہ تھا وہ، اب نہیں رہا یہ یقین ہی نہیں ہو رہا ہے۔ آج کے دور میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔''

گڈو کی والدہ مجھے دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں: ''بیٹا میرا تو سب کچھ لٹ گیا۔ میری موت کہاں چھپی تھی، اللہ مجھے اٹھالیتا۔ وہ ہمارا بڑا نیک بچہ تھا۔ جب تک اپنے ابا کے پیر نہیں دبا لیتا اسے نیند نہیں آتی۔ ہر نماز پابندی سے ادا کرتا۔ ہر ایک کی فکر کرتا۔''

میں نے محسوس کیا واقعی گڈو کی موت نے کتنے دلوں کو اجاڑ دیا ہے۔ اب کسی دل میں کوئی امنگ نہیں کوئی ترنگ نہیں۔ گڈو کے والدین، اس کے بہن بھائی غمزدہ زندگی جی رہے ہیں۔ گھر کی عورتیں مجھ سے بغلگیر ہو کر رونے لگیں۔ مجھے اس وقت احساس ہوا دوسروں کے لیے جینے والے مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان کا ہر کام ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔ گڈو ایسے لوگوں میں سے ایک تھا۔ جن کی موت برسوں نہیں بلکہ صدیوں تک یاد رہتی ہے۔ ہم انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

OOOO

شہرت

سونو بھیا اور میری سہیلی خوشبو میں بچپن سے گہری دوستی تھی۔ دونوں پرائمری سے ہائی اسکول تک ساتھ میں پڑھتے رہے۔ دونوں بہت ذہین تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا دونوں کلاس میں کبھی اول نمبر سے پاس ہوتے تو کبھی دوسرے۔ اسکول کے تمام اساتذہ اور طلباء دونوں کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ سونو بھیا طبلہ بجانے میں ماہر تھے اور خوشبو رقص کرنے اور گیت گانے میں۔ وہ ان کے ہر تال پر تھرکتی تھی۔ کبھی کبھی ایسے ہی تھرکتے تھرکتے، گانے گنگناتے ہوئے گاؤں کی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے ہمارے یہاں پہنچ جاتی۔ ہم سب ساتھ میں پڑھائی کرتے۔ اماں بھی خوشبو کو بہت چاہتی تھیں۔ وہ اسے روک لیتی اور کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دیتیں۔

اسی طرح دن گذرتے گئے۔ خوشبو نویں جماعت میں پہنچ گئی۔ جس اسکول میں ہم پڑھتے تھے اس کو قائم ہوئے پچاس سال ہو چکے تھے۔ اس لیے اسکول میں گولڈن جبلی کا پروگرام بڑے اہتمام سے منایا جا رہا تھا۔ گاؤں کے سرپنچ کا کہنا تھا: ''اس پروگرام کے ذریعہ ہم شہر کے بڑے بڑے رہنما اور اعلیٰ فنکاروں کو بلائیں۔''

اس موقعے پر چاہے ڈانس کا مقابلہ ہو یا گیتوں کا یا کوئی ڈرامہ ہو، ہر گروپ خوشبو کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا تھا۔ بمبئی سے ایک بڑی ڈرامہ پارٹی آئی ہوئی تھی۔ اس

ڈرامے میں خوشبو کو لیلیٰ کا رول دیا تھا۔ خوشبو نے اس کو خوب اچھی طرح سے ادا کیا۔ تمام ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس پروگرام کے بعد ہر ایک کی نظر خوشبو پر تھی۔ اس ڈرامے کے بعد خوشبو پوری بستی میں مشہور ہو گئی۔ ہر نوجوان کا دل اس کی چاہت میں دھڑکنے لگا۔ اگرچہ خوشبو کی رنگت بہت گوری نہیں تھی لیکن اس کا گداز بدن جاذب نظر چہرہ اور نین نقش سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ وہ اپنی سریلی آواز سے تمام فضا کو پر کیف بنا دیتی تھی۔ اس کے جسم کی لچک، اس کی اچھل کود اور اس کا بھولا پن سب کے لیے دلچسپی کا سامان بنتا جا رہا تھا۔

اس ڈرامہ کمپنی کے لڑکے دلیپ اور خوشبو میں دوستی ہو گئی۔ پھر اس دوستی نے اتنا طول کھینچا کہ اب خوشبو ہر وقت اس لڑکے کے خوابوں میں کھوئی رہتی۔ وہ اس کے خطوں کا انتظار کرنے لگی۔ ایک دن وہ خط پڑھ کر خوشی سے اچھلنے لگی۔ مجھے ایک درخت کے نیچے سائے میں لے گئی۔ اس کا مضمون مجھ کو سناتے ہوئے کہنے لگی: ''اب میری قسمت بدل جائے گی۔ میں اب بمبئی میں رہوں گی۔''

دراصل یہ خط کمپنی کے منیجر نے خوشبو کے والد کو لکھا تھا کہ: ''میری کمپنی نے اب ڈرامے کے ساتھ ساتھ فلم بنانا بھی شروع کیا ہے۔ اس فلم میں خود میرا بیٹا ہیرو رہے گا۔ ہیروئن کے لیے فلم اسٹوڈیو میں کئی بڑے شہروں سے کئی لڑکیوں کی تصویریں آئی ہیں۔ ان سب تصویروں کو دیکھنے کے بعد میرے بیٹے دلیپ نے مجھے صلاح دی ''بابوجی کیوں نہ ہم اس لڑکی کو ایک بار اپنی فلم میں کام کرنے کا موقع دیں۔ بہت خوبیاں ہیں اس لڑکی میں۔ وہ یہ رول بہت اچھی طرح کرے گی۔ وہی لڑکی جس نے میرے ڈرامے میں لیلیٰ کا رول کیا تھا۔'' خوشبو کا نام سنتے ہی مجھے یاد آیا۔ اس ڈرامے کو سب نے کتنا پسند کیا تھا واقعی اس لڑکی نے کتنی بے ساختگی سے مکالمے ادا کیے تھے۔ بہت ٹیلنٹ ہے اس لڑکی میں۔ اگر اسے موقع دیا جائے تو بہت ترقی کرے

گی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک ہفتے میں میری فلم کمپنی میں اسے بھیج دیجیے۔ ہم ہر طرح سے اس کا خیال رکھیں گے۔''

خوشبو کے والدین نے اپنی بیٹی کو تنہا اتنے بڑے شہر میں بھیجنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ پریشان ہو رہے تھے۔ آخر کار انھوں نے گھر آکر تمام باتیں سونو بھیا سے بیان کیں۔ وہ بھی اپنی بچپن کی محبت کو بڑے شہر بھیج کر برباد ہوتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ خوشبو کے والدین کو تمام طریقوں سے زمانے کے نشیب و فراز سمجھائے۔ وہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ خوشبو اتنے بڑے شہر میں اکیلی رہے۔ میں سونو بھیا کی کیفیت سے بخوبی واقف تھی۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ وقت کی لگام کو روک کر گریجویٹ ہو کر نوکری تلاش کرتے اور فوراً خوشبو کے والدین سے اپنی شادی کی خواہش ظاہر کرتے۔ ایک طرف بھیا کا یہ حال تھا اور خوشبو کو یہ احساس خوشی سے پاگل کئے ہوئے تھا کہ عنقریب وہ ہیروئن بن جائے گی۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کی تصویریں چھپیں گی۔ وہ گاؤں کی ایک معمولی لڑکی ہے۔ اس بات کا اسے احساس تھا۔ وہ اس سنہری موقع کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ والدین کے انکار کرنے پر اس نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ ایک کمرے میں خود کو مقفل کر کے زار و قطار رونے لگی۔ زہر کھا کر اپنے آپ کو مٹانے کی دھمکی دے دی۔ آخر کار اس کے غریب والدین اس خوف سے لرز اٹھے کہ کہیں ہم نے اسے بمبئی نہیں بھیجا تو وہ غصہ میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے۔ اس خوف سے خوشبو کے والد اسے بمبئی چھوڑ آئے۔

اپنی پہلی فلم میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے خوشبو نے بہت محنت کی۔ وہ فلم پروڈیوسر اور ان کے لڑکے کی ہر بات مانتی رہی، کیمرہ مین اور میک اپ کرنے والوں نے جس اسٹائل کے جیسے کپڑے پہنائے پہنتی رہی۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی۔ اس فلم نے اگرچہ بہت زیادہ شہرت حاصل نہیں کی لیکن ناکام بھی نہیں ہوئی۔ اس کے

بعد کئی دنوں تک خوشبو کو کسی فلم میں ہیروئن کا رول نہیں ملا۔ صرف کبھی کبھی کسی فلم میں مختصر سا کوئی رول مل جاتا۔ خوشبو اسے بھی بڑی محنت سے کرتی۔ منیجر صاحب کا بیٹا آہستہ آہستہ بڑا ہیرو بن گیا۔ جب خوشبو کو بڑے رول بہت کم ملنے لگے تو منیجر صاحب کے بیٹے نے خوشبو کو صلاح دی کہ وہ ڈانس بہت اچھا کرتی ہے۔ اگر اس بات کے لیے وہ مشہور ہو جائے گی تو ہر فلم میکر اسے اپنی فلم میں موقع دے گا۔ خوشبو کی آنکھوں پر اس وقت شہرت کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس شہرت کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ دھیرے دھیرے وہی ہوا جو اکثر ہیروئن بننے کے خواب دیکھنے والی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ صرف ماڈل بن کر رہ جاتی ہیں۔ خوشبو اگرچہ ہیروئن تو نہیں بن سکی لیکن مشہور رقاصہ بن گئی۔ وہ بدکاری اور گناہوں کی دلدل میں پھنستی چلی گئی۔ شرم و حیا جیسے زیور کو جب اس نے اتار پھینکا تو اس کی عزت گھٹتی چلی گئی۔ اس کے حسن میں جو کشش تھی وہ کم ہو گئی۔ وہ جو خواب لے کر گاؤں سے آئی تھی اس کو اس بڑے شہر میں پاش پاش ہوتے نظر آئے۔ وہ گاؤں لوٹنے میں شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ آخر کار بمبئی میں ایک فلیٹ لے کر رہنے لگی۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں رقاصہ کے طور پر بلائی جاتی۔ آہستہ آہستہ ان پارٹیوں نے اسے شراب کا عادی بنا دیا۔ ایک دن جب اس نے بال بناتے وقت اپنے سر میں کچھ سفید بال دیکھے، بڑھاپے کی آہٹ نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگی۔ تنہا زندگی جیتے جیتے وہ بیزار ہو گئی تھی۔ اس کے ماضی کے سوئے ہوئے ارمانوں نے انگڑائی لی۔

ایک دن منیجر صاحب کے بیٹے دلیپ سے اپنے ماضی کا ذکر چھیڑا۔ وہ اس سے اپنے سجائے ہوئے خواب دہرانے لگی۔ دلیپ نے اس کی باتیں سن کر بے باکی سے کہا:
"تم نے میرے متعلق یہ سب سوچنے کی ہمت کیسے کی۔ آج میں اس بلندی پر پہنچ چکا ہوں کہ بڑی بڑی ہیروئن میرے ساتھ کام کرنے میں فخر محسوس کرتیں ہیں۔ تم جیسی

رقاصہ سے میں شادی کروں گا یہ خیال ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دو۔ ہاں اگر تم تنہا زندگی سے بور ہوگئی ہو تو اپنا یہ خیال بابو جی کے سامنے رکھو۔ اس وقت وہ بیمار رہنے لگے ہیں اور ان کو ایک خادمہ کی ضرورت ہے۔ اگر تم سے شادی کرلینگے تو ان کی خدمت اچھی ہو جائے گی۔ ہوسکتا ہے وہ تمہاری بات مان لیں۔'' دلیپ کی باتیں سن کر خوشبو تلملا اٹھی۔ اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دلیپ کو طمانچہ رسید کردے کیونکہ ہیروئن کا خواب دکھا کر رقاصہ بنانے والا وہی تھا لیکن وہ کچھ نہ کرسکی۔ غصہ کو قابو میں رکھا اور اپنی غلطی پر خوب پچھتائی۔ ایک سرد آہ کھینچی اور دوبارہ اسی بے زار گناہ سے بھری زندگی کے موڑ پر چلنے لگی۔

سونو بھیا نے پڑھائی پوری کی۔ انھیں گاؤں کے ایک بینک میں سروس بھی مل گئی۔ وہ کبھی کبھی اخبار ورسائل پڑھتے وقت خوشبو کی تصویر دیکھ کر کہہ اٹھتے۔ اس منیجر اور اس کے لڑکے کے چکر میں خوشبو نے اپنے آپ کو برباد کردیا۔ شہرت کی سیڑھیاں چڑھنے کی جدوجہد میں وہ اب نہ تو گاؤں میں کسی کی بہو بیٹی بن سکتی تھی۔ نہ کوئی اسے عزت سے دیدی کہہ کر بلا سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ اب وہ بڑھاپے کے دور میں قدم رکھ رہی تھی۔ اب پہلے کی طرح اسے پارٹیوں میں لوگ نہیں بلاتے تھے۔ وہ خوشبو جو کسی وقت ہر نوجوان کی چاہت تھی۔ اس خوشبو کو ڈاکٹر نے کینسر جیسے مہلک مرض کی اطلاع دی۔ اس کے شراب پینے پر پابندی عائد کردی۔ لیکن اس جہان میں کون تھا جو اس کی بیماری کی خبر کو سن کر بے چین ہوتا اور کسی طرح اس کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتا۔ چند سال پہلے اس کے والدین اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ بھائی نے شادی ہوتے ہی اپنا علیحدہ گھر بسا لیا تھا۔

ایک دن ایک اخبار میں خوشبو کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے ایک مضمون چھپا۔

جس میں اس کی زندگی کے آخری موڑ کی عکاسی نہایت دردناک انداز میں کی گئی تھی۔
سونو بھیا اسے پڑھ کر رونے لگے۔ میں نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا: ''بھیا حوصلہ رکھو ہم کل ہی بمبئی چلتے ہیں۔''
بمبئی میں پہنچتے ہی کسی طرح ہم خوشبو کے فلیٹ پر پہنچے۔ جہاں ایک پلنگ پر پڑے ہوئے خوشبو زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی۔ اسے اپنے بدن اور کپڑوں کا بھی ہوش نہیں تھا۔ سونو بھیا نے اپنی جیب سے وہ رومال نکالا جو خوشبو نے انھیں ایک سالگرہ پر دیا تھا۔ وہ اس رومال کو بہت سنبھال کر رکھتے تھے۔ چند خاص موقعوں پر اسے پیٹی سے نکال کر خوشبو کی یاد تازہ کر لیتے تھے۔ اس رومال پر خوشبو نے خود اپنے ہاتھوں سے کڑھائی کی تھی اس رومال کو آگے بڑھا کر مجھے خوشبو کے برہنہ جسم کو ڈھکنے کو کہا۔
واقعی میرے سونو بھیا ان مردوں میں سے ایک ہیں جنھیں پاک صاف اور ڈھکی ہوئی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ دنیا میں ایسے کروڑوں مرد ہیں جو اپنی نظروں سے عورتوں کی برہنہ تصویر نہیں دیکھ سکتے۔ جب مردوں میں اتنی حیا باقی ہے تو پھر کیونکر عورتیں غلط فہمی کا شکار ہیں اور شہرت کی آڑ میں جسم فروشی کر رہی ہیں۔ شہرت اتنی ہی حاصل کی جائے جو صحیح اور جائز طور سے حاصل ہو۔

OOOO

تڑپ

بنڈو اور اس کی بیوی کل سے نہایت پریشان ہیں چونکہ ان کا بیٹا سونو کل سے لاپتہ ہیں۔ بنڈو نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ وہ ابھی سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ بازو کے کمرے سے بیمار بیوی کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وقت کی رفتار ست ہوگئی تھی۔ ہر لمحہ بوجھل اور ہر پل پہاڑ کی طرح سخت مختلف خیالات اور مختلف واقعات اس کے دماغ میں ہل چل مچائے ہوئے تھے۔ اچانک اس کا داماد منا اس کی بیٹی ببلی کو ساتھ لیے غصہ کی حالت میں کمرے میں داخل ہوا: "لو اپنی بیٹی کو سنبھالو۔ کچھ دنوں سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کل ڈاکٹر نے چیک کرنے پر بتایا کہ وہ تین مہینے سے حاملہ ہے۔ تم جانتے ہو ابھی ہماری شادی ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے یہ کس کا پاپ ہے۔ جو اس کے پیٹ میں پل رہا ہے۔ لاکھ پوچھنے پر وہ کچھ بتانے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ میرے ماتا پیتا جو مجھ سے پہلے ہی ناراض تھے۔ اب تو وہ ایک دن بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ میری بیوقوفی تھی جو میں اس بھولی بھالی صورت پر مر بیٹھا اور ماں باپ کے نہ چاہتے ہوئے اس گھر سے رشتہ جوڑا۔ اب یہ رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر کے میں جا رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے لوٹ گیا۔

بنڈو کی بیوی اسے آواز دیتی رہی لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ بنڈو کی بیوی بیٹی سے کئی سوال پوچھنے لگی۔ غصہ میں اسے پھٹکارتے ہوئے کہا: ''یہ کیسی کالک تو نے ہمارے منہ پر تھوپ دی۔ ہائے بھگوان تو نے بھی خوب میری قسمت بنائی۔ بچپن میں اناتھ کردیا۔ رشتہ داروں نے جھڑکیاں دے دے کر بوجھ سمجھ کر پالا اور جوان ہوتے ہی چور اچکے شرابی مرد کے پلو باندھ دیا۔'' یہ کہہ کر وہ دہاڑے مار مار کر رونے لگی اور کہنے لگی: ''میں نے ہر طرح سے انھیں سیدھے راستہ پر چلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے۔ میں نے اپنے لیے کبھی ان سے کوئی اچھا ظاہر نہیں کی۔ پھر بھی وہ اپنے شوق کے لیے چوری چکاری سے باز نہیں آئے۔ لوگوں کو لوٹتے وقت، ان کے پاکٹ مارتے وقت یہ بھی نہیں سوچا کہ میں جو پاکٹ مار رہا ہوں یہ پیسے کس کے ہیں۔ کیسی کیسی محنتیں اٹھا کر ان پیسوں کو انھوں نے اکٹھا کیا ہوگا اور کس لیے کیا ہوگا۔''

ایک دن اپنے ہم خیال دوست سے بتا رہے تھے: ''ارے یار میں نے آج جس عورت کا پاکٹ مارا۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ بھگوان کی مورتی خریدنے جارہی ہے۔ وہ مجھے شام میں گنیش کی مورتی خریدتے ہوئے نظر آئی۔ بڑی اداس ہوکر دکاندار سے کہہ رہی تھی ''مجھے بس اتنے روپیوں میں کوئی چھوٹی سی مورتی دے دو۔ بیٹا میں تمھیں کیا بتاؤں آج صبح میں دو ہزار روپے لے کر نکلی تھی۔ یہ روپئے ہم لوگ سال بھر سے اکٹھا کررہے تھے۔ اس بار میرے بچے کہہ رہے تھے کہ ماں اب کی بار تم بڑی مورتی لانا اور ہم اب کی بار کچھ زیادہ لوگوں کو کھانے پر بلائیں گے۔ لیکن میری بے وقوفی سے سب کچھ لٹ گیا۔ میں نے کنڈکٹر کو پیسے دینے کے لیے پرس نکالا۔ کسی پاپی کی نظر ان روپیوں پر پڑگئی۔ ستیاناس ہو اس کا۔ بھگوان ان کا کبھی بھلا نہیں کریگا۔ میری طرح وہ بھی تڑپے گا۔ میں گھر میں اپنے پتی سے کیا کہتی؟ وہ مجھے طعنے دیں گے، ڈانٹیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی کالی پوت میں پورے ہوئے ان چار سونے کے موتی کو آج ہی

بیچ ڈالا اور ان پیسوں کو ساتھ لیے تمہاری دکان پر آئی ہوں۔ اب تو جو کچھ کرنا ہے ان ہی پیسوں میں کرنا ہے۔ بیٹا اس مورتی کی کچھ اور رقم کم کر دے۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے۔''

بنڈو شراب کا گھونٹ پیتے ہوئے اپنے دوست سے کہنے لگا: ''یار یہ لوگ ہمیں کوسنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ان کو معلوم نہیں کہ ان کا کوسا ہمیں نہیں لگتا کیونکہ بھگوان ہمارے لیے دیالو ہے۔ ورنہ ہم کب کے پرلوک سدھار چکے ہوتے۔''

میں یہ سن کر تڑپ اٹھی۔ دل چاہا کہ ابھی دوست کے سامنے جا کر کہہ دوں کہ ''تمہارا یہ سوچنا ٹھیک نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل ضرور تم لوگوں کے پاپ کا گڑھا بھرے گا۔'' لیکن میں ڈری کہ کہیں نشہ کی حالت میں مجھے اپنے دوست کے سامنے دو چار تھپڑ مار کر ڈھکیل نہ دے۔ اس ڈر اور خوف سے جڑا ہوا پانچ سال قبل پہلے کا واقعہ اکثر بنڈو کی بیوی کے دل و دماغ پر چھایا رہتا اور جب بھی گھر میں کوئی حادثہ پیش آتا اسے اس عورت کی بددعا یاد آتی۔ جو اس نے تڑپتے ہوئے دی تھی۔

جب بنڈو کا جیب کاٹنے اور بیگ اور پیسے چرانے کا کام ہر طرح سے ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ چاہے ٹرین ہو، بس ہو، مختلف جگہ لوگوں کی لائین ہو، وہ کسی کو نہیں بخشتا۔ بے رحمی سے اس کے ہاتھ جو لگے چرانے سے مطلب۔ ایک بار تو ٹرین میں کسی وکیل کا چھوٹا سوٹ کیس روپیوں سے بھرا سمجھ کر چرا لیا لیکن اس سوٹ کیس میں سوائے کاغذات کے کچھ نہیں تھا۔ بنڈو آٹو میں بیٹھنے والوں پر نظر رکھنے لگا۔ کون انسان کتنے پیسے لے کر گھر، بینک اور دوکان سے لوٹ رہا ہے۔ ایک بار ایک عورت اپنی آٹھ سالہ بچی کو چپل دلا کر آٹو میں سوار ہوئی کہ آگے چل کر ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان سے فراک وغیرہ خرید لے۔ بنڈو اس کے پیسے چرانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ آہستہ سے بیگ کی کھلی ہوئی چین دیکھ کر رومال میں بندھے ہوئے پیسوں کی گٹھی ہڑپ لی اور دو اسٹاپ پہلے ہی اتر

گیا۔ آٹو والے نے آئینہ میں اس کی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ لیکن چونکہ وہ موجودہ دور کا انسان تھا کسی نیکی کے لیے بے خطر کود پڑنے کے جذبہ سے عاری تھا۔ وہ اپنی جان کی سلامتی کی خاطر جوکھم میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی آنکھیں موند لی لیکن اترتے وقت جب وہ عورت پیسے نہ دیکھ کر رونے لگی تو اسے رحم آ گیا اور اس نے اسے بنڈو کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ وہ پوچھتے پوچھتے بنڈو کے گھر پہنچی۔ اس عورت اور بچی نے رو رو کر کہا: ''بھیا ہمارے پیسے لوٹا دو۔ ہم تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ میں اپنی بچی کا birthday اس کے پتا کی موت کے چار سال بعد منا رہی ہوں۔ آج اس نے اپنے ساتھ کھیلنے والے سب بچوں کو گھر بلایا ہے۔ مجھے ابھی اس کے لیے فراک اور کچھ سامان خریدنا ہے۔''

بنڈو ان کو روتے ہوئے دیکھ کر ذرا بھی نہیں پسیجا۔ بلکہ گرج دار آواز میں ان کو جھڑکتے ہوئے کہا: ''چل ہٹ میرے دروازے سے۔''

اس عزت دار عورت نے ایک بدمعاش سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنی بچی کا ہاتھ پکڑا اور دروازے سے لوٹ گئی۔ لیکن لوٹتے وقت صرف یہ کہا: ''اس بن باپ کی بچی کا آج تو نے دل دکھایا ہے۔ تیرے بچوں کا بھگوان کبھی بھلا نہیں کرے گا۔ ایک دن تجھے بھی ہماری طرح تڑپنا ہوگا۔'' شاید اس عورت کے اس جملہ پر فرشتوں نے لبیک کہہ دیا ہوگا۔

بنڈو کی بے رحمی سے جڑے ہوئے ایسے سینکڑوں واقعات اس کی بیوی کے دل و دماغ پر استوار ہو کر اس کے جسم کو کمزور کر رہے تھے۔ بزرگوں کو اس نے بدھو بنا کر ان کی پنشن کو لوٹا تھا۔ جب کہ وہ شراب اور بدکاری کے نشے میں ایسا سرشار تھا کہ کبھی اپنے لیے کسی تکلیف اور مشکل کا تصور ہی نہیں کیا۔ جب لوگوں نے رائے دی کہ کب تک تم اس جھونپڑے میں رہو گے تو بڑی مشکل سے کچھ پیسے لگا کر سیمنٹ چونے کا یہ گھر

بنایا۔ بیمار اور معزور بیوی کی مجبوری سے اولاد نے پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے بھی بنڈو کی راہ اختیار کیں۔

مُنا کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹیاں چپکے چپکے رو رہی تھی۔ بنڈو کی نظریں بیٹے کے لیے منتظر تھی۔ کیونکہ بنڈو کی وجہ سے وہ طیش میں آ کر بغیر کچھ کھائے گھر سے نکلا تھا۔ پتہ نہیں کہاں بھٹک رہا ہونگا۔ دوسری جانب بیٹی کی کی ہوئی غلطی اس کو پریشان کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں اس کے گھر کے سامنے ایک آٹو رکا۔ دو نوجوان بنڈو کے بیٹے کو سنبھالتے ہوئے ساتھ لائے۔ انکل انکل نہ جانے اس کا کس کے ساتھ پنگا تھا۔ کون سالے نے اس کو گلی میں چھورا مارا اور رفو چکر ہو گیا۔

بنڈو کا خون میں لت پت بیٹا آخری سانسیں گن رہا تھا۔ اس میں بولنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے گھر والوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے ان کا آخری دیدار کر رہا ہو۔ بنڈو کا سخت دل جس میں کبھی رحم کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ پہلی بار اس پتھریلی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے روتے ہوئے اپنے بیٹے کو سینہ سے لگا لیا۔ بار بار پوچھتا رہا: ''بیٹا مجھے بتا کس نے تیری یہ دشا کی ہے۔ تو نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔''

بیٹے سے پوچھتے پوچھتے اس کی آواز میں بچوں کی سی عاجزی اور نرمی آ گئی تھی۔ بنڈو کی بیوی اپنے بیٹے کے سر کو زانو پر رکھے ساڑی کے آنچل سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ پاگلوں کی سی کیفیت طاری تھی۔ ببلی بھیا بھیا کہتے ہوئے بے حال ہو رہی تھی۔ بنڈو نے اپنے آنسو پونچھنے کے لیے رومال نکالا۔ رومال کے ساتھ جیب میں سے نوٹوں کا بنڈل گرا، ہوا سے ہر نوٹ علیحدہ ہو کر بکھرنے لگا۔ خون کے چند قطرے ان نوٹوں پر پڑے۔ بنڈو کی بیوی کے لرزتے لبوں نے کہا: ''دیکھو آج ہماری طرح یہ نوٹ بھی کیسے تڑپ رہے ہیں۔ شاید وہ آج اپنے اصلی مالکوں کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ جنھوں نے خون پسینے کی گاڑھی

کمائی سے انھیں حاصل کیا تھا۔"

بنڈو نے بین کرتی ہوئی بیوی کو سسکتے ہوئے کہا: "تو کچھ مت کہہ میں آج سمجھ چکا ہوں تڑپ کیا ہوتی ہے۔"

OOOO

امن

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بس کے بند شیشوں سے پانی اتر کر میرے کپڑوں کو تر کر رہا تھا۔ تیز بارش سے میرے بدن کے تمام کپڑے پانی سے بھیگ گئے۔ میں اس تیز بارش کو دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا اگر بس اسٹاپ پر پہنچنے کے باوجود بھی بارش نہ رکی تو میں اکرام بھائی کے یہاں کیسے پہنچ پاؤں گا؟

کسی طرح ہماری بس بارش کی مار سہتی ہوئی اسٹاپ پر پہنچی۔ میں بس سے اترتے ہی ایک شیڈ دیکھ کر بھاگتا ہوا اس کے نیچے کھڑے ہو گیا اور وہاں بارش کے تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن بارش کی تیزی میں کوئی کمی نہیں آئی، آخر جب کھڑے کھڑے تھک گیا تو بارش کے رکنے کا انتظار کئے بغیر شیڈ سے باہر آ کر آٹو رکشہ تلاش کرنے لگا۔ اس تیز بارش میں کوئی بھی آٹو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بہ مشکل ایک آٹو رکا۔

میں نے اسے دیکھ کر کہا: ''بھائی امبیڈکر چوک چلو گے؟''

آٹو والے نے میرے اس جملے کو دوبارہ دہراتے ہوئے کہا: ''ہاں آپ کو کہاں جانا ہے امبیڈکر چوک جانا ہے نا؟ ہاں ہاں جلدی بیٹھئے! میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ مجھے آپ کو کہاں پہنچانا ہے۔ وہیں نا! جہانگیر روڈ۔ اگر آپ جہانگیر روڈ کہتے تو میں پہلے ہی

سمجھ جاتا۔''
میں آٹو والے کی زبان سے جہانگیر روڈ کا نام سن کر ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگا۔ کتنی عجیب بات ہے؟ تاریخ بدل جاتی ہے، دور گزر جاتے ہیں لیکن لوگوں کی زبان پر وہی قدیم نام باقی رہتے ہیں۔ حالانکہ ایک وقت تھا جب جہانگیر روڈ عوام کے لیے مسئلہ بن کر ابھرا تھا۔ یہ جہانگیر روڈ آج بھی لوگوں کے لیے امبیڈکر روڈ نہ بن سکا، ایک دور تھا جب اس نام کے مسئلے نے اتنا طول کھینچا تھا کہ چار دنوں میں اس مسئلہ نے فساد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس فساد کی آگ میں بیشتر خاندان جھلس کر رہ گئے لیکن اس لوٹ کھسوٹ، تباہی اور بربادی کے بعد لوگوں کے حصے میں ذلت اور تنگدستی کے علاوہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ جس پارٹی کے لیڈران نے یہ نام بدلنے کی تجویز کی تھیں ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ وہ سب کے سب اسی طرح ایئر کنڈیشن مکانوں میں پرمسرت زندگی جی رہے ہیں۔
میں رمضان کی زندگی پر جتنا سوچتا، کڑھتا اور تلملا کر رہ جاتا۔ اس بیوقوف آدمی نے فساد کی اس آگ میں کودنے سے قبل اس کے نتائج کے متعلق کچھ تو غور کر لیا ہوتا، تو آج اسے ایسی کربناک زندگی جینے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا......
رمضان نیک دل پرخلوص انسان ہے، میرے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ میرے بیٹے کے ساتھ مجھے اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا۔ ٹرین کے چھوٹنے کے پہلے تک وہ مجھے میری رغبت کی چیزیں پیش کرتا رہا حالانکہ وہ فساد کی آگ میں اپنا آدھا ہاتھ گنوا چکا ہے لیکن اس کے باوجود بھی میری مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔
تقریباً ۱۵ سال پہلے کی بات ہے جب میں اس شہر میں رہتا تھا، مجھے رہنے کے لیے ایک سرکاری بنگلہ ملا تھا۔ جس کے وسیع صحن میں ایک چھوٹا سا آؤٹ ہاؤس تھا۔ میرا مختصر خاندان اس بنگلے میں پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ آؤٹ ہاؤس کے استعمال کی

مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی، وہ اسی طرح بند پڑا تھا۔
ایک دن ہمارے گھر کی ملازمہ کنیزا میری بیوی سے کہنے لگیں، مجھے آج آنے میں اس لیے دیر لگی کیونکہ میری طبیعت گھبرا رہی ہے، ابھی بھی میرا کچھ کام کرنے میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ میری بیوی غریبوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ بعض اوقات وہ میرے پہنے ہوئے کپڑے خیرات کر دیتی۔ پوچھنے پر جواب میں کہتی آپ بہت دنوں سے اس سوٹ کو نہیں پہن رہے تھے، اس لیے میں نے اسے دینا مناسب سمجھا......
شفقت ملازمہ سے یہ سن کر کہ آج اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے، اس کی دلجوئی کرنے میں مشغول ہو گئیں۔ جب اسے پتہ چلا کہ کنیزا کو یہاں آنے کے لیے کافی پیدل چلنا پڑتا ہے۔ اس رات اس نے مجھے اصرار کرتے ہوئے کہا: ''ہمارا آؤٹ ہاؤس ویسے بھی جب سے ہم آئے ہیں خالی پڑا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں کنیزا کو اس میں رہنے کی اجازت دے دوں۔ بیچاری کو کام کے لیے بڑی دور سے آنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے وہ بہت تھک جاتی ہے۔''
میں نے جواب میں کہا: ''میں نے کبھی کسی اچھے کام کے لیے منع کیا ہے جو کہ اب مداخلت کروں گا۔''
شفقت میرا یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئی اور مسکراتے ہوئے کہا: ''مجھے میرے سرتاج سے یہی امید تھی، لیکن اس کے باوجود میں نے آپ کی اجازت لینا ضروری سمجھا۔'' دوسرے دن اس نے خوشی خوشی کنیزا کو اس آؤٹ ہاؤس میں رہنے کی اجازت دے دی۔
کنیزا کی طرح اس کا شوہر رمضان بہت ملنسار شخص تھا، وہ ہر روز فٹ پاتھ پر اپنی پنکچر بنانے کی دکان لگاتا۔ کبھی کسی کی سائیکل سدھارتا تو کبھی کسی کا اسکوٹر بناتا، اس طرح وہ بہت جلد غریب امیر ہر طبقے میں معروف ہو گیا۔ ہر شخص اسے رمضان بھائی کے نام

سے مخاطب کرتا، وہ ہر قسم کے بحث ومباحثے میں شریک ہونے لگا، الیکشن کے وقت جس شخص کو جس پارٹی کی ٹکٹ چاہیے تو وہ رمضان بھائی کا سہارا لیتا، رمضان بھائی بڑھ چڑھ کر اس شخص کے لیے دوڑ دھوپ کرتے، نعرے بلند کرتے، اسے ٹکٹ دلواتے اور کامیابی سے نوازتے۔

ایک دن جب میں نیوز پیپر پڑھ رہا تھا، یہ خبر پڑھی کہ ہمارے شہر کے کچھ سیاستداں جہانگیر روڈ کا نام بدل کر امبیڈکر روڈ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ محض دو فرقوں کو آپس میں لڑوانے کی ایک سیاسی چال تھی۔ اس سے زیادہ کوئی مقصد نہ تھا۔

اس وقت شاید یہ مطلب پرست لیڈر یہ بھول چکے تھے کہ یہ ملک جتنا ایک قوم کو عزیز ہے۔ اس سیکولر ملک کی آزاد فضا میں ہر شخص کو جینے کا یکساں حق ہے، کیونکہ اسے غلامی سے نجات دلوانے میں، زرخیز بنانے اور اسے سینچنے میں ہر قوم نے تن من دھن کی قربانی دی ہے۔ اس کی خدمت کی ہے، لیکن بعض اوقات چند عہدے دار قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر جائز اور ناجائز کام کروا کر اسے کمزور بنا دیتے ہیں۔ ایسے شہر نہ صرف برسوں تک بلکہ صدیوں تک دنیا کے لیے شرمندگی کا باعث بن جاتے ہیں۔

یہی حالت ہمارے شہر کی ہوئی، فساد کی لہر دوڑتے ہی شہر کی فرقہ وارانہ فضا نے شہر کا امن درہم برہم کر دیا۔ مختلف اقوام کے جو لوگ سر بلند کر کے ایک ساتھ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کھڑے رہتے تھے ان کی دوستی آن کی آن میں نفرت میں بدل گئی، ان کے مزاج بدل گئے۔ ایک جانب ایک فرقہ تاریخ سے جڑا قدیمی نام بدلنا نہیں چاہتا تھا، تو دوسری طرف دوسرا فرقہ نام بدلنے کے لیے ہٹ دھرمی کر رہا تھا، جو لوگ مذہب اور مذہبی رسم ورواج کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے وہ بھی اس امن پسند شہر میں ہاتھوں میں چھرے اور لاٹھی لیے کھلے عام گھوم رہے تھے کیونکہ چند اخبارات انہیں حوصلہ دے رہے تھے۔ حالانکہ یہ سب جانتے تھے کہ سب ہی مذہبوں

کی آخری منزل امن شانتی ہے۔ ہم سب ایک ہیں اور یہ ہندوستان، یہ گلستاں ہمارا وطن ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔ لیکن اس وقت لوگوں نے یہ سب بھول کر عقل وشعور کی آنکھیں بند کرلیں تھیں۔ فساد کے بہانے بدچلن غنڈے اپنی من مانی کرر ہے تھے، اس وقت انھوں نے انسانیت کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ہر طرح سے اس کی دھجیاں اڑا دیں۔

رمضان کی بیوی کنیزا جو پچھلے دو مہینے سے حاملہ تھی۔ وہ خوبصورت تو تھی لیکن ان دو مہینوں میں اس کی رنگت اور زیادہ نکھر آئی تھی۔ اس کا چہرہ آنے والے مہمان کی خوشی میں تابناک ہو گیا تھا، حالانکہ وہ نقاب نہیں پہنتی تھی لیکن ڈھیلے ڈھالے لباس اور بڑے سوتی دوپٹے سے چہرے اور اپنے بدن کو ڈھانکے رکھتی تھی۔ باوقار خاندان کی عورتوں کی طرح اس کے چہرے پر ایک قسم کا تقدس بکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک ملازمہ ہے۔ جب کبھی وہ پانی لانے کے لیے باہر آنگن میں آتی، لوگوں کی نظریں اس کی خوبصورتی پر مرکوز ہو جاتیں۔ اس وقت وہ شرما کر اپنے الجھے ہوئے بالوں کو لپیٹنے میں مشغول ہو جاتی۔

ایک رات جب تمام شہر فساد کی آگ میں جل رہا تھا، گھر اور دکانیں لٹ رہی تھیں۔ لٹیروں کو جو کچھ کرنا ہوتا وہ کرتے۔ جیسے اس وقت وہ تمام سزاؤں سے آزاد تھے۔ اس وقت ہر شخص سہم کر کانپ رہا تھا اور ظالموں کے ظلم سے پناہ کی دعا مانگ رہا تھا، اس درمیان میری اور رمضان کی غیر موجودگی میں چند غنڈے out house میں آئے، آتے ہی کنیزا کے منہ پر پٹی باندھ کر اس کی عصمت لوٹ لی۔ جب ہم شہر کے حالات کا معائنہ کر کے گھر لوٹے، گھر میں آتے ہی رمضان دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

دراصل کنیزا نے اپنی عصمت لٹنے کے بعد دوپٹے سے گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو ختم کر

دیا تھا، رمضان اس کے ہاتھ کی بند مٹھی سے چٹھی نکال کر جلدی جلدی پڑھنے لگا، جس میں یہ تحریر درج تھی: ''آپ کی غیر موجودگی میں چند غنڈے کمرے میں گھس آئے تھے، انھوں نے میری عصمت ریزی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اب میں آپ کو منھ دکھانے کے لائق نہیں رہی، مجھے معاف کرنا...... اس لیے میں دنیا سے جا رہی ہوں...... تمھاری کنیزا۔''

ان خوفناک حالات میں کنیزا کی لاش کسی طرح سپرد خاک کی گئی۔ لیکن اس حادثے کے بعد رمضان باغی اور سرکش ہو گیا، جب بھی شہر میں فساد کی بھنک پڑتی لٹیروں کے ذریعہ گھر اجڑتے دیکھتا تو فوراً اس خاندان کی حفاظت کے لیے دوڑتا، وہ کنیزا کی عصمت لوٹنے والے لٹیروں کا نام معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کہیں سے اسے کوئی سراغ مل جائے، وہ جاننا چاہتا ہے کہ کس نے اس کی محبت کو لوٹا ہے، کس نے اس کی زندگی کی بہاریں چھینی، جمعہ کے روز جب شہر کے تمام لوگ بڑی مسجد میں نماز کے لیے اکٹھا ہوئے۔ اچانک مسجد کے صحن میں بم دھماکہ ہوا، تمام لوگ بکھر کر ادھر ادھر بھاگنے لگے، ایسے ماحول میں لوگوں کو قابو میں لینے کے لیے پولیس کو لاٹھیاں اور گولیاں چلانی پڑیں۔ رمضان اس لپیٹ میں آگیا، گولی اس کے ہاتھ پر پڑی جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ جاتا رہا۔

اس دن وہ بہت جوش میں تھا، بیوی کے بدلے کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہر غنڈے کے چہرے کو تک رہا تھا، شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ بدکار انسان اور غنڈے کسی ایک قوم کی میراث نہیں ہوتے بلکہ کسی بھی طبقے، کسی بھی قوم میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ رمضان کی اضطرابی اور بے چینی کو دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا کہ انتقام کی یہ آگ اسے شیطان نہ بنا دے۔ اس کے ایسا ہونے سے قوم میں پھر ایک جاہل غنڈے اور بدکار انسانوں میں اضافہ ہوگا۔ پھر نہ جانے کتنے غنڈے جنم لیں گے۔ تمام قوم مشکوک نگاہوں سے دیکھی

جائے گی۔ یہ سب سوچ کر میں نے رمضان کو اپنے گھر بلایا اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ: ”یہ سچ ہے کہ ان فسادات میں تم لٹ چکے ہو، لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ ہم ان مسئلوں کو ان معاملات کو آپس میں بیٹھ کر سلجھائے۔ اس وقت شانتی اور امن کی زبان بولیں کیونکہ اس امن میں ہی ہمارے محلے، ہمارے شہر اور ہمارے ملک کا فائدہ ہے، ورنہ فسادات کی یہ بربادی ہمیں غریبی کی طرف لے جائے گی۔ اس کا سیدھا اثر فٹ پاتھ پر لگنے والی دکانوں پر پڑے گا۔ وہ ہفتوں مہینوں بند پڑی رہے گی۔ پھر ان گھروں میں مفلسی کا راج ہوگا۔ اسلام ہمیں سلامتی کا پیغام دیتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم اس راہ کو اپنائیں، کیوں لوگ جوش میں ہوش کھو بیٹھتے ہیں، چند فسادات تو صرف چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بلکہ افواہوں کی بناء پر ہوتے ہیں، وہ نفرت کا بیج بو کر دلوں کو پاٹ کر لوٹ جاتے ہیں، معاف کرنے میں ہر ایک کی بہتری ہے اس لیے ہم سب بھول کر اتفاق اور اتحاد کے ساتھ سر بلند کر کے جئے، میں اکرام بھائی کے پاس جا رہا ہوں ہو سکے تو تمھیں اپنی گیرج میں کسی کام پر رکھ لے۔ تم اور کتنے سال تک میرے ملازم بن کر رہو گے، اسی لیے میں میرے دوست اکرام کے پاس آیا ہوں، یہ میرا قدیم شہر ہے۔ یہاں کا کچھ بھی تو نہیں بدلا، وہی گلیاں، وہی کوچے، ویسی ہی سڑکیں ہیں......
ان محلوں کے قدیم لوگ قدیم نام لے رہے ہیں اور نئے لوگ نئے، لیکن ان ناموں سے ان محلوں کو کیا سروکار! لوگ انہیں کسی بھی نام سے یاد کریں۔ وہ یوں ہی برقرار رہیں گے...... ہنستے مسکراتے اور امن پسند زندگی جینے کا درس دیتے ہوئے۔“

OOOO
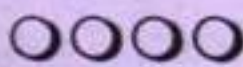
ندامت

کالج کے صحن میں چند زرد اور خشک پتے پڑے ہوئے تھے۔ گرم ہوائیں چل رہی تھیں جو تمازت سے لبریز تھیں۔ اس سخت دھوپ میں کالج کے طالبات اپنا اگزام کارڈ لینے کے لیے آفس کے کاؤنٹر پر لمبی قطار میں کھڑے ہوئے تھے، اسی اثنا میں سیما کی سہیلی خوشبو دوڑتی، ہانپتی اور لائن کو چیرتی ہوئی آئی اور کہنے لگی: ''اس وقت سیما کہاں ملے گی، مجھے اس سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

کسی نے سیما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''دیکھئے وہ قطار کے بیچ میں سیما کھڑی ہے۔''

پھر اس نے سیما کو کچھ سمجھاتے ہوئے کہا: ''میرے موبائل پر تمہارے گھر سے فون آیا ہے، ہمیں اسی وقت گھر جانا ہوگا......''

دراصل یہ خبر سیما کے والد کے انتقال کی تھی۔ ان کا ایک حادثے میں اچانک انتقال ہو گیا تھا، کہیں یہ خبر سن کر سیما اپنے ہوش وحواس نہ کھو بیٹھے، اس خوف سے اس کے گھر والوں نے یہ اطلاع سیما کی سہیلی کے موبائل پر دی اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ تم صرف کسی طرح سیما کو فوراً گھر لے آؤ...... سیما کارڈ لینے کے لیے اپنے تمام کاغذات بابو کو دے چکی تھی اور قطار میں کھڑی اپنے نمبر آنے کا انتظار کر رہی تھیں، اس کا نمبر

آنے میں ابھی صرف ۱۵ یا ۲۰ منٹ کا وقت باقی تھا، سیما نے خوشبو کی زبانی یہ سن کر کہ اسے فوراً گھر چلنا ہے، اس نے بابو سے عاجزانہ انداز میں کہا: ''پلیز سر، مجھے میرا identity card اور میرے دیگر کاغذات لوٹا دو میں بعد میں آ کر اپنا کارڈ لے جاؤں گی۔''

یہ بابو کالج کا سب سے زیادہ چڑچڑا شخص واقع ہوا تھا، ہر وقت کسی نہ کسی بات پر طالبات کو ڈانٹتا رہتا تھا۔ طالبات بھی اس کے اس برتاؤ سے اس کا نام سن کر عجیب سا منھ بناتی تھیں۔ کچھ طالبات نے اسے اپنی طرف سے ہٹلر کا خطاب دے رکھا تھا، اور وہ اسے آپس میں اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ اکثر ٹیچرس بھی اس کی بدمزاجی دیکھ کر اس سے بات کرنے سے کتراتی تھیں کیونکہ وہ بغیر سوچے سمجھے کسی کو بھی کچھ بھی کہہ دیتا تھا۔ اسے زبان پر قابو نہیں تھا، یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جو مستقبل سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ تو جوانی کے نشے میں تھوڑی دیر کے لیے یہ سوچتے ہی نہیں کہ زندگی کیسے کیسے رخ بدلتی ہے، حالات انسان کو کس کس موڑ پر کھڑے کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات اس کے جسم کے اعضاء اس کا ساتھ چھوڑ کر اسے مجبور اور اپاہج بنا دیتے ہیں۔ تمام زندگی لفظوں کا بیوپار کرنے والے جن کی تمام زندگی ڈینگیں مارنے میں گزری وہ زندگی کے آخری دنوں میں دو لفظ کہنے کے لیے مجبور نظر آتے ہیں، ایسے وقت وہ کبھی اپنے گزرے ہوئے دنوں کی یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں اور کبھی بیتے کارناموں کو یاد کر کے خوش ہوتے ہیں، دل ہی دل میں مسکراتے ہیں......

اس بابو نے سیما کو سخت لہجے میں کہا: ''تمہارے جیسے بہانے کرنے والے میں نے بہت دیکھے ہیں، مجھے ایسے لوگوں سے خوب نبٹنا آتا ہے، اگر تمھیں کارڈ چاہیے تو آج ہی لے جانا ہوگا، ورنہ بعد میں ہم نہیں دے سکتے، ہم کو دوسرے کام بھی دیکھنا ہے، آگے تمہاری مرضی۔!''

سیما کے دل ودماغ پر اس شخص کا ایک ایک لفظ ہتھوڑے برسا رہا تھا، وہ یہ سب سن کر تلملا اٹھی، اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس کی سہیلی خوشبو نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا: ''چل کچھ لوگ ہوتے ہی ہیں الٹے دماغ کے، ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ چلو فوراً گھر چلتے ہیں۔''

لیکن سیما کی تلملاتی خاموشی فریاد بن کر فضا کو چھوتی ہوئی خدا کی بارگاہ میں پہنچ چکی تھی، وہ خاموش تھی لیکن اس کے ٹوٹے ہوئے دل نے خدا کے یہاں کے رجسٹر میں سب کچھ لکھوا دیا تھا، بے شک! اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے، کسی طرح وہ اپنی سہیلی کے ساتھ گھر پہنچی، لیکن تمام راستہ میں منصوبہ بناتی رہی اور یہ طے کرلیا کہ ''اللہ نے چاہا اور میری مدد کی تو میں پڑھ لکھ کر ضرور اس کالج میں ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی پوسٹ کے لیے نامزد ہوں گی۔''

بعض اوقات زندگی میں ناکامیابی ہی کامیابی کی سیڑھی ثابت ہوتی ہے۔ سیما کے ساتھ یہی ہوا۔ سیما کے والد کے انتقال کے وقت اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ وہ گھر میں سب بہن بھائیوں میں بڑی تھی۔ اپنی ذمہ داریوں کو خوب جانتی تھیں۔ ابتدا میں اس کی والدہ نے سلائی کر کے گھر کے اخراجات کو سنبھالا۔ آہستہ آہستہ ان کی بینائی کم ہوتی گئی، اس وجہ سے ان سے وہ کام چھوٹ گیا۔ گھر میں تنگدستی کا راج ہونے لگا۔ ایسے وقت سیما نے خوب محنت سے پڑھ لکھ کر معاشیات میں ایم اے کیا اور خالی وقت کو نہ گنواتے ہوئے کمپیوٹر سے جڑے دو تین امتحان پاس کر لیے۔ اب وہ اس قابل ہوگئی تھی کہ اسے کسی بھی اچھی جگہ ملازمت مل سکتی تھی......

ایک دن اس نے اخبار میں پڑھا کہ وہ جس کالج میں پڑھتی تھی وہاں رجسٹرار کی پوسٹ نکلی ہے۔ فوراً اس نے درخواست بھجوادی۔ اس کی مسلسل محنت کامیابی کی کنجی بن گئی، وہ جو چاہتی تھی ویسا ہی ہوا۔ اس پوسٹ کے لیے اس کا تقرر ہوگیا۔

اپنے حسن سلوک سے وہ بہت جلد لوگوں میں مشہور اور ہر دلعزیز ہوگئی۔ ایک دن جب وہ تیز تیز قدموں سے اپنے روم میں پہنچی، اس نے دیکھا کہ ایڈمیشن اور مختلف کاموں کے لیے اس سے ملنے والوں کا ہجوم کھڑا ہے، یکے بعد دیگرے کئی لوگ ملنے کے لیے اس کے پاس چلے آرہے ہیں۔ وہ آہستگی سے سب کی مشکلات حل کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے میں ایک بوڑھا شخص اپنے بیٹے کو ساتھ لیے داخل ہوا، اس شخص کو سیما نے غور سے دیکھا، بہت جلد اس کے تصور میں اس بوڑھے شخص کی نوجوانی اور تیز مزاجی گھومنے لگی۔ اسے وہ دن یاد آنے لگا جب وہ امتحان کا ہال ٹکٹ لینے کالج گئی تھی حالانکہ اس شخص کے بوڑھے ہونے پر اس میں کافی بدلاؤ آگیا تھا، سر کے تمام بال سفید ہوگئے تھے، چہرے سے سامنے کے گرے ہوئے دانت کی وجہ سے گویائی میں فرق پڑ گیا تھا، سنبھلتے ہوئے اسے اپنا مطلب ادا کرنا پڑ رہا تھا، اس کے ساتھ میں اس کا ہم شکل نوجوان لڑکا بیساکھی ہاتھ میں لیے لنگڑاتے ہوئے اپنے والد کے کاندھوں کا سہارا لیے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بوڑھے شخص نے سیما کو سلام کیا اور پھر ہاتھ جوڑ کر منت کرتے ہوئے کہا: ”میڈم یہ میرا لڑکا ہے، ابھی چھ مہینے پہلے accident سے اس کا ایک پیر چلا گیا۔ اس وجہ سے اسے اس کے ورک شاپ سے نکال دیا گیا۔ اب وہ سوائے بیٹھ کر ہونے والے کاموں کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا، اب آپ کی مہربانی سے ہی اسے یہاں کوئی کام مل سکتا ہے، اگر آپ اس کے لائق کوئی کام اس آفس میں دلوا سکے گی تو بڑی مہربانی ہوگی، اس کی بیوی بھی کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ اسے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مجھے اس کے حال پر بڑا ترس آتا ہے، کل رات جب میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا، اچانک مجھے اس کالج کی یاد آئی اور ایسا لگا جیسے اسے صرف اسی کالج میں اس کے مطابق کوئی کام مل سکتا ہے، اس لیے آج بڑی امید پر اس کو میں اپنے ساتھ لیے آیا

ہوں، اب آپ ہی اسے اپنی مہربانی سے اس کے مطابق کوئی کام پر رکھ سکتے ہیں، آگے اللہ کی مرضی۔"

سیما اس شخص کی زبان سے یہ عاجزانہ الفاظ سن کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہوئیں: "جب انسان ترقی کرتا ہے اور خدا اسے اپنی رحمت سے نواز کر اسے بڑے عہدے پر فائز کرتا ہے تو اس وقت یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ جس کرسی پر وہ بیٹھا ہے اسے ایک دن اسی کرسی سے اترنا پڑے گا، خدا نے اسے یہ عہدہ، یہ حقوق تکبر اور ظلم کرنے کے لیے عطا نہیں کیا بلکہ اس عہدے کے ذریعہ اسے لوگوں کی خدمت کا ایک موقعہ دیا ہے، ان حالات میں اسے گویا پرکھا جا رہا ہے کہ وہ اپنے وقار کو قائم رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اخلاق کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے یا نہیں۔ ان حالات میں اس میں فرشتوں کی سی نرمی قائم رہتی ہے یا اس میں شیطان کی طرح تکبر اور غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اچھائی اور برائی میں سے کون سا راستہ اپنے لیے چنتا ہے۔ یہ اس پر منحصر ہوتا ہے۔"

سیما ان خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ بابو کی آواز نے اسے جھنجھوڑا: "میڈم پھر آپ نے میرے بیٹے کے بارے میں کیا سوچا ہے، کیا فیصلہ کیا ہے۔"

سیما نے جواب میں کہا: "جبکہ آپ نے اتنے سال کالج میں کام کیا ہے، ہم آپ کو ایسے کیسے بھیج سکتے ہیں۔ آپ یہ تمام documents چھوڑ دیجئے میں آج ہی management سے بات کر کے تم کو بتاتی ہوں۔"

سیما کے یہ الفاظ سن کر بابو نے حیرت سے پوچھا: "میڈم! کیا آپ مجھے پہچانتی ہو؟"

سیما نے جواب میں کہا: "ہاں، میں بھی اسی کالج کی طالبہ ہوں۔ اس وقت اس کالج کے صحن میں شیڈ نہیں تھا۔ ہم سب سہلیاں چلچلاتی دھوپ میں لائن میں کھڑے ہو کر اپنے نمبر کا انتظار کرتیں تھیں۔"

بابو سیما کے چہرے کو خوب پڑھ رہا تھا۔ اسے گزرا ہوا وہ دن یاد آ گیا جب اس نے سیما کو جھڑکا تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے سیما سے کہا: ''ان دنوں میں بھی بہت غصہ میں رہتا تھا۔ شاید اللہ کو میری یہ حرکت پسند نہیں آئی، اس لیے بڑھاپے میں مجھے میرے بچے کا یہ حال دیکھنے کو ملا۔''

اس کے یہ جملے ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سیما یہ سب خوب اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے جواب میں اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''اطمینان رکھئے میں آپ کے بچے کے لیے پوری کوشش کروں گی۔ آگے اللہ کی مرضی۔!''

OOOO
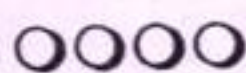
ڈاکٹر قمر جہاں کے افسانے سماجی حقائق کے تناظر میں ہیں، ان کا تانا بانا آئے دن رونما ہونے والے واقعات و حادثات سے تیار ہوا ہے۔ انھوں نے حسد، انتقام، عیاشی، ریاکاری، غرور اور مفاد پرستی کے قبیح نتائج کو حسن وخوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل افسانوں میں زیادہ تر عورت کی اچھی اور بری نفسیات نظر آتی ہے جو ان کی زندگی کو مسرت وشادمانی یا رنج وغم کے حوالے کرتی ہے۔

ڈاکٹر شرف الدین ساحل

ZINDAGI TERE LIYE

Short Stories

By

DR. QAMAR JAHAN